داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

اکتالیسواں سال | فہرست مضامین جون سنہ ۶۲ء | شمارہ (۶)

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
اُردو کی نایاب مثنویاں ---- جوہر ٹونکی ---------- ۹
عہدِ مغلیہ کے شاہی خزانے کے جواہرات ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۸
ابوالعلاء المعری پر ہندوستانی فلسفہ کے اثرات ۔ سید احتشام احمد ندوی ۲۷
اقبال کی گھریلو زندگی ---------- محمد الیاس مسعود ---------- ۳۲
حافظ شیراز ---------- خانم ممتاز مرزا ---------- ۳۵
باب الانتقاد ---------- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ---------- ۴۱
باب الاستفسار ۔۔ نیاز ۔ (۱) مہارانا اُدے پور اور خاندان مغلیہ سے رشتۂ ازدواج
(۲) شاہ دولا کے چوہے
(۳) نوروز اور عہد مغلیہ
(۴) کتب احادیث کی جمع و ترتیب
منظومات :۔ ممتاز مرزا ۔ پروفیسر شور ۔ واہی ۔ حبیب احمد صدیقی
شارق ایم ۔ اے ۔ ارشد صدیقی ۔ حرمت الاکرام
مطبوعات موصولہ ---------- نیاز ----------

ملاحظات

انجمن ترقی اُردو پاکستان

مولانا عبدالحق کی موت یقیناً ایسا معمولی سانحہ نہ تھا کہ اسے جلد بھلایا جاسکتا اور نہ انجمن ترقی اُردو کا مسئلہ ایسا آسان تھا کہ اسے فوراً سلجھایا جاسکتا ۔ اس کے لئے بڑے غور و بڑے صبر و تحمل کی ضرورت تھی اور خوشی کی بات ہے کہ فیصلہ آخری کے لئے اس وقت تک جس انتظار طویل سے کام لیا گیا وہ رائگاں نہ گیا، کیونکہ جناب اختر حسین صاحب کا انتخاب صدارت کے لئے اور جناب جمیل الدین عالی کا انتخاب معتمدی کے لئے، دونوں اپنی اپنی جگہ حد درجہ مناسب و موزوں ہے، ان دونوں حضرات نے مولانا عبدالحق مرحوم کی زندگی میں بھی انجمن کے ثبات و ترقی کے لئے بہت کچھ اور بعض بڑے نازک مواقع پر تو یوں کہنا چاہئے کہ :۔ "گرتا ہوا گھر تھام لیا"

بنابراں ان حضرات سے زیادہ موزوں ان اہم خدمات کے لئے کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا ۔ لیکن اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا انجمن کی قدیم روایات کو زندہ رکھنے کے لئے جدید تجربات سے کام لیا جائے گا یا نہیں اور وہ جدید تجربات کیا ہوسکتے ہیں۔ یقیناً ان حضرات کے سامنے وہ سب کچھ ہوگا جو انجمن اور انجمن کے وسیع مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور جس کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں، تاہم انجمن کی قدیم تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے کہ جب تک ہندوستان سے تعلق رہا، انجمن اپنے وجود کو اعانت غیر سے بے نیاز نہ رکھ سکی اور باوجود غیر معمولی وسائل آمدنی کے وہ اپنی بنیاد کو اتنا مضبوط نہ کرسکی کہ آیندہ کے لئے اس کو کسی کے سامنے دست سوال پھیلانے کی ضرورت نہ ہوتی ۔

اس میں شک نہیں انجمن نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں وہ بہت اہم و قابل ستایش ہیں، لیکن ان خدمات کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے وہ اپنے آپ کو کسی ایسے ادارہ میں تبدیل نہ کرسکی کہ وہ کسی امیر و سلطان کا دست نگر نہ ہوتا۔ پھر یہ بات ایسی نہیں جو موجودہ ارباب انجمن کے سامنے نہ ہو اور وہ غالباً مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ آج کل ہر پبلک ادارہ کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے تجارتی اصول پر چلایا جائے۔

اس وقت پاکستان میں اُردو کی ترویج و اشاعت کا کام کافی وسیع ہوگیا ہے۔ علاوہ انجمن کے ترقی اُردو بورڈ، اور رائٹرس گلڈ دو ادارے اور بھی ہیں جو علم و ادب کی اچھی خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی ہنوز خودکفیل نہیں ہوسکے ہیں، حالانکہ بنیادی چیز یہی ہے۔

اس میں شک نہیں ان تینوں اداروں کا نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور ان کا رُخ ایک ہی منزل کی طرف ہے، لیکن راہیں غالباً مختلف ہیں۔ اس لئے ضرورت اب صرف اس بات کی ہے کہ جن راہوں سے گزر رہے ہیں ان سے وہ بےخبرانہ نہ گزریں اور اپنے استحکام و استقلال کے لئے دوسروں کے دستِ نگر نہ بنے رہیں۔

زبان کی خدمت کا تعلق صرف جراید و رسایل ہی سے نہیں ہے، بلکہ اچھی اور مفید کتابوں کی اشاعت سے بھی ہے اور مجھے دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ یہ ادارے اس حقیقت سے بےخبر نہیں ہیں اور اس دوران میں جو کتابیں انھوں نے شایع کی ہیں بہت مفید ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے زیادہ تر انفرادی حیثیت رکھتا ہے، حالانکہ اصل چیز اجتماعی جد و جہد ہے۔

اگر یہ تمام ادارے تقسیم کار کے اصول پر کام کریں، مثلاً انجمن ترقی اُردو صرف نصاب کی کتابوں کی تصنیف و اشاعت کو، ترقی اُردو بورڈ علم و تاریخ کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے اور رائٹرس گلڈ تنقید صحیح کے پیش نظر صرف رسایل و جراید کی رہنمائی اپنا مقصد اولیں قرار دے لے، تو تھوڑے عرصہ میں بہت کام ہوسکتا ہے بشرطیکہ یہ سب کچھ کوآپریٹیو اصول پر ہو اور انفرادی نفع و ضرر کا سوال باقی نہ رہے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں، ان اداروں کے ارباب نظم بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے اور امید ہے کہ ان کا یہ احساس آج نہیں تو کل ضرور بروئے کار آئے گا۔

کتنا اچھا ہو اگر یہ تمام ادارے لمیٹڈ کمپنیوں میں تبدیل ہوجائیں اور باقاعدہ تجارتی اصول پر ان کو چلایا جائے، اس طرح نہ صرف یہ کہ فراہمی سرمایہ کی صورتیں زیادہ وسیع ہوجائیں گی، بلکہ عوام و خواص کو ان سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوجائے گی۔

مسلمانانِ ہندوستان کا احساس

حال ہی میں مولانا سعید اکبرآبادی کا ایک بیان شایع ہوا ہے، جس میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"مسٹر چھاگلا نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو مذہبی اقلیت نہ سمجھیں مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انھوں نے ہی کہی ہو بلکہ مسلمانوں کا ہر باشعور اور روشن ضمیر لیڈر بھی یہی کہتا ہے اور خود مسلمان بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے اس عددی اکثریت و اقلیت کے قایل نہیں ہیں کیونکہ خود قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس تفریق کو عملاً کبھی تسلیم نہیں کیا اور انھوں نے اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ ملکی و وطنی زندگی کے ہر شعبہ میں دل کھول کر اشتراک کیا۔ لیکن اب مسلمانوں میں اقلیت کے ہونے کا جو احساس پیدا ہو رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے

کہ اکثریت کا دل و دماغ ان کی طرف سے صاف نہیں ہے اور اس بناء پر جب مسلمان یہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ دستوری اعتبار سے وہ اور اکثریت کے فرقہ کے لوگ دونوں برابر ہیں لیکن ملکی و وطنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے اور وہ عددی اقلیت میں ہونے کے باعث وہ منافع آسانی سے حاصل نہیں کرسکتے جو دوسرے کرتے ہیں تو اُن میں اقلیت کے احساس کا پیدا ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ کوئی برادر خورد لاکھ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ وہ خورد نہیں بلکہ صرف بھائی ہے، لیکن جب اُس کے برادر بزرگ کی طرف سے روز روز زجر و توبیخ ہو، جھاڑ پھٹکار ہو تو آخر کب تک وہ تنگ آکر نہیں کہے گا کہ "سگ باش و برادر خورد مباش!" .... پس جب حالات یہ ہوں اور کسی ایک جگہ نہیں بلکہ ہر اسٹیٹ میں (مدراس اور میسور کو مستثنےٰ کرکے) اور ہر مقام پر تو پھر کوئی بتائے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پُرامن زندگی کا احساس و شعور پیدا ہو تو کیونکر ہو؟ اب اگر وہ اپنے آپ کو اقلیت سمجھنے پر مجبور ہوں تو اس میں ان کا کیا قصور؟ اس بناء پر اگر آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ احساس دور ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپ شاہ مدار بن کر مرتے ہی کو مارنے لگیں بلکہ آپ کا فرض ہے کہ جن اسباب سے یہ احساس پیدا ہوا اور ہو رہا ہے اُن کو دور کرنے کی سعی کریں۔ یہی ملک و وطن کے ساتھ سچی خیرخواہی ہے اور یہی اُس کی سب سے بڑی خدمت! ...... جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کے گزشتہ پندرہ برسوں کے عمل سے یہ بالکل عیاں ہے کہ انھوں نے تقسیم کے وجوہ و اسباب کی تلخ یاد پر خط تنسیخ و فراموشی کھینچ دیا ہے اور اب وہ نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرکے قومی زندگی میں اُسی جوش اور ولولہ کے ساتھ حصہ لینے کے لئے بیتاب ہیں، جس جوش اور ولولہ کے ساتھ وہ تقسیم سے پہلے لیتے تھے۔ وہ اس ملک کو اپنا وطن عزیز جانتے ہیں، انھیں اس کے در و دیوار سے محبت اور انسیت ہے لیکن افسوس ہے کہ مجموعی طور پر ہندوؤں نے ماضی کی اس تلخ یاد کو فراموش نہیں کیا ہے اور اس کا ثبوت آئے دن کے فسادات اور ملازمتوں سے ملتا ہے یہاں تک کہ میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں کے داخلہ میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا اس بنا پر اگر مسلمان بحالات موجودہ قومی زندگی میں بھرپور حصہ نہیں لے رہے ہیں تو اس کی مسئولیت اُن پر نہیں بلکہ حکومت یا اکثریت پر عاید ہوتی ہے .... تحریک آزادی کا خاتمہ ملک کی تقسیم پر ضرور ہوا لیکن اس کا الزام صرف مسلمانوں کو دینا حقایق سے مجرمانہ انکار کرنا ہے، کچھ اور نہیں تو اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت کچھ کھوکھنا پڑا اور اب بھی اس کا سلسلہ چلا جا رہا ہے۔"

معاصر "قومی آواز" نے یہ اقتباسات اپنی ۱۵ مئی کی اشاعت میں "مصرعِ ثانی کی ضرورت" کے عنوان سے درج کئے ہیں جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان شکایات کے دور کرنے کی صورتوں پر بھی غور کرنا چاہیئے چنانچہ ۱۶ مئی کی اشاعت میں اس کی کچھ تدابیر بھی بتائی ہیں، لیکن ان کو پڑھ کر ہم کو معلوم ہوا کہ اڈیٹر قومی آواز نے مصرعۂ ثانی تو ضرور فراہم کیا، لیکن وہ ایک حد تک خارج الوزن ہے۔ جیسا کہ اس نے ظاہر کیا ہے یہ بالکل درست ہے کہ ہندوستان کے تمام ہندوؤں کی ذہنیت وہ نہیں ہے جس کی شکایت مولانا سعید احمد نے کی ہے اور یقیناً ان میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جو اکثریت و اقلیت کے مسئلہ کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے، لیکن ان کی ذہنیت کو سراہنے سے حالات و واقعات کو نہیں بدلا جاسکتا۔ مسلمانوں کو صرف اسی وقت اطمینان ہوسکتا ہے جب یہ محسوس کریں کہ زندگی کی تمام راہیں ان کے لئے اسی طرح کھلی ہوئی ہیں جیسی ہندوؤں کے لئے اور کوئی مانع راہ میں حایل نہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اب تک یہ اطمینان حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

اس وقت ہندوستان کا مسلمان تین طبقوں پر منقسم ہے، ایک مزدوری پیشہ یا حرفتی طبقہ، دوسرا کاروباری طبقہ اور تیسرا وہ جو نوکری پر زندگی بسر کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے بہت سے ایسے نئے کام شروع ہو گئے ہیں جن میں مزدوروں اور چھوٹے چھوٹے کاریگروں کی ضرورت بڑھ گئی ہے اور مسلمان مزدور اور کاریگر بھی اس سے فایدہ اُٹھا رہے ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ کام لینے والے مذہبی اختلاف کو فراموش کر چکے ہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ ان کی بڑھی ہوئی ضرورت انھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ ان سے بھی سودا کریں

کاروباری طبقہ میں اول تو مسلمان یوں بھی بہت کم نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں بے شک چند سر بر آوردہ تاجر موجود ہیں، لیکن ان کے علاوہ باقی تمام مقامات میں بہت چھوٹی چھوٹی تجارتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں اور بڑے بڑے ہندو تاجران کو پنپنے نہیں دیتے۔ رہا سوال ملازمت یا نوکری کا۔ سو سب سے زیادہ شکایت مسلمانوں کو یہی ہے کہ اس باب میں ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا۔ ہر چند میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اگر مسلمانوں کو ان کی نسبت آبادی کے لحاظ سے چند ہزار نوکریاں مل جائیں تو بھی اجتماعی حیثیت سے ساڑھے چار کرور مسلمانوں کے اقتصادیات پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ گو جس حد تک اصول جمہوریت کا تعلق ہے، مسلمانوں کی یہ شکایت بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جمہوری نظام تمدن کی خوبی کا انحصار صرف اسی امر پر ہے کہ اقلیت و اکثریت کا احساس لوگوں کے دلوں سے مٹ جائے اور تمام ترقی یافتہ جمہوریتوں میں یقیناً یہ احساس ہٹ گیا ہے، لیکن ہندوستان میں اس کا ختم ہو جانا بظاہر دشوار ہے، کیونکہ دوسری جمہوریتوں میں تو "احساس مذہب" بالکل باقی نہیں رہا، لیکن ہندوستان میں یہ احساس صرف آئین و دستور کے صفحات تک محدود ہے، علاوہ مذہبیت و عصبیت سے دور نہیں۔

پھر اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جس نسل نے حکومت کو سنبھالا اس نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی، اور ایک دو کے سوا سب کے سب مذہبی روایات کے معتقد و پیرو تھے، اس لئے "تاریخ ہند کا جو نیا ورق پلٹا گیا وہ بھی بالکل سادہ نہ تھا بلکہ اس پر پچھلی روایات کے نقوش قایم تھے اور ان پر نئے نقوش اچھی طرح اُبھر نہ سکے۔ دوسرے یہ کہ تقسیم ہند کا زخم بھی ایسا نہ تھا جو جلد مندمل ہو جاتا۔ اس کی یاد اکثر ہندوؤں کو تڑپاتی رہتی تھی۔ جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ تقسیم ہند کے بعد بھی کروڑوں مسلمان یہاں موجود ہیں تو انھیں روحانی تکلیف ہوتی تھی یہاں تک کہ جن سنگھ کی جماعت ہی اسی احساس کی بدولت وجود میں آ گئی اور اس نے طبقۂ عمال کے اکثر افراد کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے مسلمان میں جذبۂ وطنیت پیدا ہوا صرف اس مجبوری کی بنا پر کہ ــ "مرتا کیا نہ کرتا" کسی خوشدلی کی بنا پر نہیں جس کا تعلق اکثریت کی رواداری یا وسعت اخلاق سے ہے۔

اس میں شک نہیں ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور اس کی تقریباً نصف ارب آبادی کو جمہوریت کی صحیح روح سے آشنا کرنا آسان نہیں ہے، لیکن جس حد تک حکومت و افراد حکومت کا تعلق ہے اسے یقیناً سمجھنا چاہئے کہ جمہوریت کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے جس کو سامنے رکھنا ان کا فرض اولین ہے اور مسلمانوں کو اگر شکایت ہے تو یہی کہ وہ اس فرض کو کماحقہٗ انجام نہیں دیتی۔

ایک دو نہیں، ہزاروں مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ایک مسلمان کو ملازمت یا ترقی سے صرف اس لئے محروم رکھا گیا کہ وہ مسلمان ہے اور ایک ہندو کو باوجود نااہلی کے مسلمان پر صرف اس لئے ترجیح دی گئی کہ وہ ہندو تھا۔ اور صاف صاف اس کو ظاہر بھی کر دیا گیا۔ پھر غور کیجئے کہ یہ سُن کر مسلمان کے جی پر کیا گزر جاتی ہوگی اور وہ کیونکر صحیح جذبۂ وطنیت اپنے اندر پیدا کر سکے گا۔

پھر اگر وطنیت کا جذبہ صرف خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جانے پر استوار ہو سکتا ہے تو ہم مدیر قومی آواز کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کی تمام مسلم آبادی جذبۂ وطنیت سے سرشار ہے اور اس کو کسی مزید وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں، لیکن اگر

اس جذبہ کا تعلق احساس خوشدلی سے بھی ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کے اکثر مسلمانوں کا دل اس جذبہ سے قطعی محروم ہے جس کا پیدا کرنا صرف اکثریت کے طرزِ عمل پر منحصر ہے، اقلیت کی قوتِ برداشت پر نہیں، پھر جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی دوسری نسل جس کو آیندہ حکومت سنبھالنا ہے، وہ بھی اسی جذبۂ عصبیت کی شکار ہے تو ہم کو اور زیادہ مایوسی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں یہ جذبہ مذہب کی راہ سے نہیں آیا بلکہ قومیت کی راہ سے آیا ہے اور قومیت سے مراد وطنیت نہیں بلکہ وہ روایتی کلچر ہے جو یقیناً مسلمانوں کے روایتی کلچر سے مختلف ہے اور اس اختلاف کے دور ہونے کی کوئی صورت بظاہر نظر نہیں آتی۔

ان حالات میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ کروڑوں کی آبادی ہندوستان چھوڑ کر باہر تو جا نہیں سکتی، اسے یہیں رہنا ہے، یہیں مرنا ہے، اس لئے یقیناً اسے سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی زندگی یہاں کیونکر بسر کر سکتی ہے۔

ہماری رائے اس باب میں یہ ہے کہ اسے اب یہ سوچنا ہی نہ چاہئے کہ یہاں کی اکثریت اسے کس نگاہ سے دیکھتی ہے، بلکہ خود اپنی جگہ اسے ایک اچھا شہری بن جانا چاہئے، عملی و ذہنی دونوں حیثیتوں سے۔ یعنی خود اس کی طرف سے کبھی کسی ایسی بات کا مظاہرہ نہ ہونا چاہئے جو بلندیِ اخلاق کے منافی ہو اور اسی کے ساتھ اسے آئین پر بھروسہ رکھ کر پوری قوت کے ساتھ ہر موقع پر انصاف کا مطالبہ کرنا چاہئے، قطع نظر اس سے کہ نتیجہ کیا ہوتا ہے، میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ مسلمان احساس کمتری کا شکار ہو کر ہمت ہار بیٹھیں اور اپنے اوپر جذبۂ مایوسی طاری کریں، ان کو سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کی سرزمین پر انھیں بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے جیسا اکثریت کو اور اس حق کے بقا و حصول کے لئے ہر طرح کی آئینی جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ کوئی مضایقہ نہیں اگر اس میں وہ فی الحال کامیاب نہ ہوں، لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے درست نہیں، کیونکہ آج نہیں تو کل جمہوریت ہند کو سوچنا پڑے گا کہ وہ پانچ کرور مسلم آبادی کو عرصہ تک غیر مطمئن رکھ کر اپنی ساکھ دُنیا میں قایم نہیں رکھ سکتی اور نہ ملک میں امن و سکون کی فضا پیدا کر سکتی ہے۔

جیسا کہ مدیر قومی آواز نے لکھا ہے، یقیناً یہاں کے تمام ہندو خراب ذہنیت کے نہیں ہیں اور ان میں واقعی صحیح جذبۂ انسانیت پایا جاتا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ اس فضا میں آیندہ اور زیادہ وسعت پیدا ہو اور وقت ضرورت مسلمانوں کو اس سے فایدہ اُٹھانا چاہئے ایک مصیبت اور بھی ہے جس میں مسلمان مبتلا ہیں یعنی یہ کہ وہ خود متحد الفکر نہیں ہیں اور مذہبی و سیاسی اختلافات کا شکار ہیں اسی لئے ان کا کوئی لیڈر و رہنما ایسا نہیں جو انھیں متحد کر کے کسی متعین راہ پر چلا سکے اور یہ اتنی بڑی کمی ہے کہ جب تک مسلمان خود اس کو دور نہ کر لیں، اکثریت سے کسی شکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نظم و نسق اس موضوع پر معاصر "مدینہ" نے اپنے ایک اداریہ میں بڑی معقول باتیں کہی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:- کسی ملک کی مادی ترقی خواہ کتنی ہی بلندیوں تک پہونچ جائے، لیکن اگر اس ملک کا نظم و نسق ٹھیک نہیں ہے تو مادی ترقیاں زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہو سکتیں۔ برصغیر ہند کی تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کے سب ہی مفکر، سیاست داں اور ماہرینِ قانون کہا کرتے تھے کہ برطانوی سامراج نے ملک کے "نظم و نسق" کا جو معیار مقرر کر لیا ہے وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے، ہماری جدوجہد آزادی کا ایک منتہائے نظر یہ بھی تھا کہ جب ہم آزاد ہوں گے تو ہماری حکومت ملک کے طول و عرض میں ایسا امن قایم کر سکے گی کہ جان و مال کو کسی وقت بھی کسی طرح کا خطرہ باقی نہ رہے گا۔ انگریز چونکہ اپنے مخصوص مقاصد کی حد تک نظم و نسق کو قایم رکھتا تھا جب اُس کے مقاصد و مفادات کا تقاضہ ہوتا تھا، ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے تھے اور جب تقاضہ دوسرا ہوتا تھا تو کنٹرول ہو جاتے تھے۔ اس لئے ہم آرزوئیں کیا کرتے تھے اور دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ انگریز جائے تو یہ آئے دن کی مصیبتیں، جان و مال اور عزت و آبرو کے خطرے دور ہوں۔ لیکن جب انگریز چلا گیا اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا تو ہم نے دیکھا کہ "نظم و نسق" کے بارے میں ہمارے تصورات میں کوئی خاص اور قابل ذکر انقلاب نہیں آیا۔

ہم فرقہ وارانہ فسادات کا مکمل سدِ باب کرنے میں ناکام رہے ہیں، اور اس کی بڑی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے حکمرانوں، اور حکومت کی مشینری چلانے والوں کے دل و دماغ میں انگریز کے زمانہ سے "نظم و نسق" کے بارے میں جو تصورات قایم ہو چکے تھے وہی آج بھی جاری ہیں، حکام آج بھی پہلے سے خطرہ کی بو سونگھ لینے کے عادی نہیں بنے ہیں، مالدہ کا فساد ہو یا راج شاہی کا، اگر نظم و نسق کے نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے گا تو دونوں ممالک کے حکام کا یہ قصور صاف نظر آجائے گا کہ فضا بہت پہلے سے مکدر تھی، لیکن وہ غافل تھے۔

بعض غیر محتاط طبیعتیں حکام کی غفلت کو بدنیتی سے تعبیر کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ بعض حکام جان بوجھ کر غفلت برتتے ہوں، لیکن جو حکام جان بوجھ کر غفلت نہیں برتتے ہیں اگر ان کی نفسیات کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ کچھ باتیں پہلے سے انکے علم میں ضرور تھیں اور وہ باتیں واقعات رونما ہو جانے کے بعد اُس واقعہ کا سبب نظر آنے لگیں۔ لیکن جس وقت وہ باتیں ہو رہی تھیں وہ چنگاریاں اُڑ رہی تھیں اُس وقت وہ بیچارے ان چنگاریوں کو کسی شعلہ کا پیش خیمہ سمجھ ہی نہیں رہے تھے، اور یہ بھی ایک طرح کی غفلت ہی ہوئی اور ایسی مثال شاید مشکل ہی سے ملے گی کہ کسی علاقہ کے حکام نے چنگاریوں کو جان بوجھ کر ہوا دی ہو کہ وہ ایک زبردست شعلہ بن جائیں اور انکے علاقہ کے امن و امان کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ یہ کام ضلعی سطح کے حکام انجام نہیں دیتے، اس کام کے لئے بڑے بڑے سیاستداں پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہ بات ہم اس لئے کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جو سرد جنگ کی فضا پیدا ہو گئی ہے، بدقسمتی سے انسانیت، شرافت، جان و مال، عزت و آبرو سب ہی کچھ اس سرد جنگ کی نذر ہوتا جا رہا ہے، دونوں طرف نظر ڈالئے، ان بیانات اور ان اخباری خبروں اور اداریوں پر نظر ڈالئے جو فسادات کا سبب بنے ہمارے محترم وزیر اعظم پنڈت نہرو نے جو بیان مالدہ کے فسادات پر دیا ہے اُس کے بارے میں یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ وہ ہندوستان و پاکستان کی سرد جنگ کا اثر لئے ہوئے نہیں ہے، کیا پنڈت نہرو کی جیسی عظیم شخصیت جو دُنیا کے مسایل کو حل کرنے کا حوصلہ اور عزم رکھتی ہو۔ اُسکے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ مالدہ کے فسادات پر اظہار افسوس کو اور راج شاہی فسادات کی مذمت سے الگ الگ کر دیتی، یا اگر دونوں جگہ کے فسادات کی مذمت ہی کرنا تھی، تو اس دلسوزی، حقیقت پسندی، اور متوازن کلام کے ساتھ کرتی کہ عوام اور حکام کے ذہنوں پر یہ اثر نہ پڑتا کہ دونوں ملکوں میں یہ روایت قایم ہو چکی ہے کہ ایک جگہ کا ردِ عمل دوسری جگہ ہوتا ہی رہے گا۔

---

۳۰ جون سے پہلے پہلے

انعامی بانڈ

خریدئیے

۳۰ جون سنہ ۱۹۶۲ء کو انعامی بانڈوں کی فروخت بند ہو جائے گی۔ انعامی بانڈ خریدئے تاکہ آپ کو دلکش انعام جیتنے کا سنہرہ موقع مل سکے۔

آپ جو بانڈ اب خریدیں گے وہ یکم ستمبر سے شروع ہونے والی آئندہ گیارہ تماہی لاٹریوں میں شریک کئے جائیں گے

قومی بچت آرگنائزیشن

ڈی اے ۱۱/۱۱۰

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا	کپڑا	کپڑا
سلکی پلین	**سلکی پرنٹس**	**اونی**
جورجٹ	فرنچ کوئین	گیبرڈین
بجرگ	چھوکرہ کوئین	سوٹنگ
کریپ	ساٹن فلورنس	شال
ساٹن	گولڈ کریپ	سرج
ٹفاٹہ	دل بہار	پانامہ
بنٹرت کلاتھ	لنن	پرشیا
شنٹون	شنٹون	
نائلن		
ننون		

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ جی۔ ٹی روڈ۔ امرت سر

تار کا پتہ: "رین" Rayon. ٹیلیفون 2562.

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹیڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

اُردو کی نایاب مثنویاں

(جوہر ٹونکی)

مثنوی نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ہر قسم کا مضمون بیان ہو سکتا ہے۔ اور ہر قسم کے احساسات اور ادراک کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ رزمیہ، تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، قصص و افسانے وغیرہ غرض یہ کہ جس قسم کا مضمون چاہیں مثنوی میں بیان کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قصیدہ اور غزل کی طرح تمام نظم میں شاعر کسی خاص قافیے اور ردیف کا پابند نہیں ہوتا نہیں ہوتا اور اس عدم پابندی سے بہت سی کلفت دور ہو جاتی ہے اور شاعر کی طبیعت جولانی میں کوئی رکاوٹ سدِ راہ نہیں ہوتی۔ چونکہ مثنوی میں اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں ہے۔ اس لئے جو چاہیں اور جس قدر چاہیں اشعار لکھ سکتے ہیں۔

مثنوی منسوب بمثنیٰ ہے۔ جو اثنین اثنین بمعنے دو دو کا اسم معدول ہے ـــــ الف بقاعدۂ الحاق یائے نسبت کی حالت میں واؤ سے بدل گیا۔ چونکہ مثنوی کے ہر بیت میں دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اس لئے اس کا نام مثنوی ہے۔

اہل فارس مثنوی کے موجد و مخترع ہیں۔ عربوں نے مثنوی کہنا فارسی تتبع میں شروع کیا اور اس کا نام مزدوجہ رکھا یعنے اصطلاح میں وہ شعر جس کا ہر مصرع مستلزم قافیہ ہو۔ اس لئے مثنوی کی ہر بیت کے لئے دو قافیے لازم ہیں۔ مثنوی میں ردیف عیب اور غزل میں زیب ہے۔

جو لوگ قدیم فارسی زبان میں شاعری کے قایل ہیں وہ کسی طرح بھی اس کو نہیں مان سکتے کہ یہ صنف شعر عربی زبان کے اثر سے فارسی میں پیدا ہوئی ہے اور نہ وہ یہ یقین کر سکتے ہیں کہ عربی رجز سے جس میں واقعات بیان کئے جاتے ہیں فارسیوں نے یہ صنف تقلیداً اختیار کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو عربی رجز اس قدر طویل نہیں ہوتی جن میں وہ تمام واقعات بیان کئے جائیں جو فارسی کی مثنویات میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسرے عربی زبان میں کوئی مثنوی آج تک ایسی نہیں لکھی گئی جو کسی فارسی زبان کی مثنوی کے ہم پلہ ہو۔ تیسرے یہ کہ متقدمین اور متاخرین کا اتفاق ہے کہ عربوں نے مثنوی فارسیوں کی تقلید میں کہنی شروع کی ہے جب ہم پرانے فارسی اشعار کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہم کو سب سے قدیم شعر مثنوی کا وہ ملتا ہے جس کی بابت ابو طاہر خاتونی نے کہا ہے کہ عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ میں قصر شیریں میں جو ابھی تک خانقین میں ویران نہ ہوا تھا یہ شعر ایک کتبہ پر لکھا ہوا ملا۔

پژیرا بگیہاں انوشہ بزی ‫ ‫ جہاں را بدیدار توشہ بزی

اس شعر کو مختلف طرح سے لکھا گیا ہے مگر سب سے بہتر قرأت یہی ہے جو لکھی گئی۔

سب سے قدیم قصے کا جو پتہ چلتا ہے وہ وامق و عذرا کا قصہ ہے۔ جو امیر عبداللہ طاہر کو نیشاپور میں حسب روایت دولت شاہ پیش کیا گیا تھا یا زریر و اودکس کی داستان منظوم ہے جس کا ذکر جیکسن صاحب نے اپنی تاریخ میں کیا ہے اگر ہم یہ کہیں کہ مثنوی سب سے پہلے کس نے لکھی تو یہ ایک طویل بحث ہو جائے گی ـــــ ذیل میں صرف مختصر بحث کے ساتھ اُن مثنویات (اُردو) کا جایزہ لیا جائے گا جن کا ذکر تذکروں میں ہماری نظر سے نہیں گزرا اور اگر گزرا تو اختلاف کے ساتھ۔ چونکہ صنفِ مثنوی پر بہت کافی بحث کی جا سکتی ہے اور اگر مثنویات کے نام گنائے جائیں تو اسی قدر مشکل ہوگا جس قدر ابتدا سے لے کر انتہا تک جملہ شعراء کی صحیح تعداد لکھنا۔ اس لئے جگہ محدود ہونے کے باعث

نہ جملہ مثنویات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے نہ ان پر تنقیدی نظر ـــــ صرف اُردو کی چند نادر اور کمیاب مثنویات پر سرسری نظر ڈالی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۰۱۱ھ میں قطب شاہ والی گولکنڈہ نے ایک مثنوی نعت میں لکھی اور یہی پہلی مثنوی تھی جو دکھنی بھاشا میں کہی گئی، اس کے بعد متعدد مثنویاں اس سرزمین میں لکھی گئیں جن میں غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ہنوز مشہور ہیں، عادل شاہی دور میں نصرتی نے مثنوی علی نامہ لکھی اور پھر اسی دور میں ایک دلچسپ مثنوی (ملکا اور بادشاہ زادہ) محمود دکن نے لکھی جس کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا، یہ مثنوی اب نایاب ہے صرف ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے جس کا سن تصنیف سنہ ۱۱۰۰ھ ہے اور اختتام کی تاریخ خود مصنف نے آخر میں لکھی جس کے تین شعر یہ ہیں:-

(اختتام)

مرتب ہوا یاں یہ قصہ تمام — کہوں اب یو کس وقت پایا نظام
تھی تاریخ ابکار دیں سو ماہِ سفر — سو پنجشنبہ کا دن تھا، سربسر
نبی کی جو ہجرت برس یکہزار — ہو یکسو پہ بولیا ہوں یو یادگار (سنہ ۱۱۰۰ھ)

اس مثنوی کی ابتدا مصنف نے اس طرح کی ہے:-

(ابتدا)

سنو اے عزیزاں کہتا ہوں سو بات — سمجھو کہ بعضے حکایت کے دھات
نہیں گرچہ میرے سرانے سوں کام — ہے عارف سو نکتہ میں پاوے تمام
کہوں قصہ میں سب یو اظہار کر — کہتے ہیں کہ تھا شاہ یک بختور
دھرے نام سلطان فیروز شاہ — اتھا مصر کا شہر تو تخت گاہ
تھے بیٹے بھی اُسکے نہ فرزند سو — اچھے شاہ اوسے بات دلبند ہو
ملیکا اچھا ناؤں اُس نار کا — اُٹھا جگ میں شہرہ اُس اوتار کا
اُسی نار کی یک یو خورشید نور — تھی اچپل لطافت نزاکت میں پور

اس مخطوطہ پر تین مُہریں ہیں پہلی نصیب خاں مہمندی کی، دوسری مہر اُن کے بیٹے نصیر خاں مہمندی کی، تیسری اُن کے پوتے رو خاں مہمندی کی ایک مُہر میں سنہ ۱۱۹۱ھ پڑھا جاتا ہے۔

اسی دور میں ملا ہاشمی نے مثنوی یوسف زلیخا لکھی اور اس کے بعد خواجہ بحری نے سنہ ۱۱۱۲ھ میں ایک مثنوی "من لگن" تصوف میں لکھی اس کے بعد میر شمس ولی کا دور آگیا، نگار فروری ۵۶ء صفحہ ۴۲ پر امیر احمد علوی لکھتے ہیں کہ "ولی نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حال میں لکھی"۔ مگر یہ بات غلط ہے کہ ولی نے صرف ایک مثنوی لکھی، ولی نے تین مثنویاں لکھی ہیں، علوی صاحب نے مثنوی دہ مجلس کا ایک شعر نقل کیا ہے:-

ہوا ہے ختم یو جب درد کا حال — تھا گیارہ سو پہ اکتالیس واں سال

حالانکہ کلیات ولی مرتبہ احسن مارہروی جس کو مولوی عبدالحق مرحوم نے تصحیح کے بعد چھاپا ہے، اس میں دہ مجلس کے دو تاریخی شعر اس طرح ہیں:-

ہوا ہے ختم یو جب درد کا حال — گیارہ سو پو تھا اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول — ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

دوسری مثنوی ولی کی شہر سورت پر ہے:-

بھری ہے سیرت و صورت میں سورت — ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں — چھپا اندر سبھا کو لے عدم میں
ہزاراں اس سبب شیدا ہیں بلبل — کہ ہیں دہاغنچۂ لب دائما گل

تیسری مثنوی نعت میں ہے :-

شتابی سوں دے لے ساقی مہرباں — برہ کا جام جوں سورج درخشاں
کہ خورشیدِ نبوت کی مدح میں — کنول کا دل کھلا سینے کے درج میں

اسی زمانہ میں محمد جی المتخلص (صنعتی) نے دکن میں ایک نہایت طویل اور اہم تاریخی مثنوی لکھی - جو اب نایاب ہے - اس مثنوی کا نام "تاریخ غریبی" ہے، قریب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور تاریخی اعتبار سے اپنی نوعیت کا نہایت اہم نسخہ ہے - اس کی تصنیف کی ابتدا ۱۱۶۳ھ اور انتہا ۱۱۶۴ھ ہے، مثنوی مذکور کو راقم الحروف نے بڑی کوشش کے بعد ایک دکھنی کتب خانہ سے حاصل کیا ہے اور اب راقم الحروف کی ملک ہے - کچھ اقتباسات اس کے یہ ہیں :-

دربیان سبب تصنیف کتاب

سنو عاجزی کرے بچارا — اس کتاب کا جوڑن ہارا
نا کچھ عربی علم پہچانے — نا ہیں فارسی کا کچھ جانے
میاں جی کا ہے در پل داسی — ناجی ٹولے کا ہے باسی
ان کے صدقے اللہ او بارے — بہو ساگر سے پار اتارے
ہے وا صاحب بخشن ہارا — جس کی رحمت اپرم پارا
لکھیا نیت کر سیدھی بولی — کہ کہ کڑی تھی سو وہ کھولی
سمجھے سارے خاص عوام — مورکھ چتر سکھی بزنام
پہونچے سب کو نفع نصیبی، — ناؤں رکھا تاریخ غریبی،
گیارہ سو چوسٹھ پر پاہی — کئی شروع از فضل الٰہی
اس کا کوئی عیب نہ کیجو، — پردہ پوشش صنعتی کر دیجو

اس کے بعد اکثر مثنویاں لکھی گئیں جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے - ۱۱۶۹ھ میں سید بلاقی نے ایک مثنوی معراج نامہ لکھی - اس کا ایک نسخہ راقم الحروف کے کتب خانہ میں موجود ہے -

قصہ ہیں پڑھوں سب خلق میں عجب — کہ تھا چاند شوال ماہِ رجب
ہزار ایک پنج شصت نبی سال میں — کہ یکشنبہ کا روز خوش حال میں

یہ تھیں دکن کی چند مثنویاں جن کا ذکر تذکروں میں نہ ہونے کے برابر ہے - "تاریخ غریبی" اور "قصۂ ملیکا بادشاہ زادہ" یعنی محمود کا تو نام ہی نہیں -

اس دور کے بعد میر اور سودا کا زمانہ آیا - اور مثنوی نے کافی ترقی پائی، مرزا سودا اور میر تقی میر نے متعدد مثنویاں لکھیں - میر اور سودا کے زمانے میں زبان میں کافی تبدیلی اور ترقی ہو چکنے کے بعد جس قدر مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں اکثر نایاب ہیں -

سب سے پہلے میر ممنون[1] کی مثنویاں قابلِ ذکر ہیں، کلیاتِ ممنون میں متعدد مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی "جلوس مرزا اکبر بادشاہ" دوسری مثنوی "در تہنیت شادی آفاق مرزا" تیسری مثنوی "در تہنیت شادی آفاق مرزا" چوتھی مثنوی "در تہنیت جلوس مرزا محمد اکبر شاہ بادشاہ"

(۱) مثنوی در تہنیت جلوس جہاں پناہ مرزا اکبر بادشاہ :-

سحر گہ کہ دل بال افشاں ہوا
کئی دم میں طے وسعِ امکاں ہوا

گیا چھوڑ یہ نکتۂ آب و تاب
کہ تھا خطۂ خشک و ترسے وہ پاک

نظر آئی وہ قسمتِ دلکشا
کہ کہتے ہیں جس کو ہوائے فضا

یہ پروندِ اکرم بنا دے کیا
فضائے عناصر کو سب طے کیا

ہوا خاطرِ بستہ کو انبساط
عجب اہتزاز و نہایت نشاط

اس مثنوی کے ۴۰ اشعار ہیں۔

(۲) در تہنیت شادی آفاق مرزا جہانگیر بہادر :-

چلی اب بہ شکلِ نشاط بادِ صبا
عروسِ چمن کی تو زینت بڑھا

زِ زیبائی گل سے کرشانہ دام
بنے طرۂ سنبلِ مشک فام

خدِ گل کو غازے سے رنگین کر
رخِ لالہ پر عنبریں خال دھر

ندے گوشِ گل کو تو بے زیوری
ہر اک برگ پر کر یہ صنعت گری

گریبانِ نگیں ہیں با آب و تاب
لگا غنچہ سے تکمۂ لعلِ ناب

بنے گردنِ شاخ او طرفہ کار
بنا جلد شبنم سے موتی کے ہار

ہر اک نخلِ گلپوش کو سبز کر
بنا گل کی ہیکل بنے ہر شجر

قدِ نار دان کو کر اب حلہ پوش
کہ جوں خوشقداں ہو وہ جلوہ فروش

بنے پائے سرو لبِ آب جو
بھنورے بنا جلد خلخال تو

بنے تہنیت آسوئے بادشاہ
کہ ہے آج اُس کے خلف کا بیاہ

وہ مرزا جہانگیر دلبند شاہ
کہ نائب ہے خورشید کا مثلِ ماہ

اس مثنوی کے ۱۴۰ اشعار ہیں۔

(۳) مثنوی در تہنیت شادی آفاق مرزا بابر بہادر :-

دلوں میں یہ ہیں کس کے شادی کے چاؤ
کہ ہے شاہدِ ان چمن کا بناؤ

رکھے آئینۂ آب کو روبرو
سنورتا ہے سرو لبِ آب جو

اس مثنوی کے ۱۰۶ اشعار ہیں۔

[1] فخر الشعرا میر کمال الدین ممنون، ملک الشعراء میر فخر الدین منت کے صاحبزادے ہیں۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گلشن بیخار میں اور مولوی کریم اللہ نے طبقات شعراء میں اور صابر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر بہت پر زور الفاظ میں کیا ہے اور ممنون کو صاحب طرز استاد مانا ہے۔ ممنون کا دیوان کافی ضخیم ہے ۹۰ صفحات کے متن کے علاوہ حاشیہ پر بھی بعض غزلیات ہیں۔ ممنون کو جملہ اصناف سخن میں استادانہ قدرت حاصل ہے۔ ان کا دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے جس کے صرف چار نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک حیدر آباد، دوسرا کلکتہ میں، تیسرا لندن میں، چوتھا راقم الحروف کے کتب خانہ میں ہے۔ اس میں ممنون کی نجملہ اصناف سخن کے چار مثنویاں ہیں جسے موصوف کی قادر الکلامی اور زور بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مصرعوں کی تصحیح حاشیہ پر ممکن ہو، خود مصنف کے ہاتھ کی ...

(۴) در تہنیت جلوس مرزا محمد اکبر بادشاہ :-

تماشہ آج کی تھی صبح پُر نور جبین مہ وشاں یا عالم نور
تعالیٰ اللہ عجب ہے صبح پُر انوار تجلی ایک اُس کی آئینہ دار

اس مثنوی کے ۲۰۴ اشعار ہیں۔

(۵) در تہنیت جلوس شاہ عالم بادشاہ

(۶) در تعریف تخت بادشاہ شاہ عالم

(۷) در تعریف باغِ حیات بخش

(۸) در تعریف بارہ دری

(۹) در تعریف حوض

(۱۰) در تعریف تالاب

۱۲۶۶ھ میں جگناتھ خوشتر نے مثنوی بھاگوت کی تکمیل کر کے مثنوی رامائن کا آغاز کیا۔ امیر احمد علوی کا "نگار" فروری ۱۹۵۶ء میں لکھنا غلط ہے کہ جگن ناتھ خوشتر نے ۱۲۶۶ھ میں رامائن کا ترجمہ کیا، بلکہ اس سن میں رامائن کا آغاز کیا گیا ہے جیسا کہ بھاگوت منظوم کی تاریخ اختتام لالہ روشن لال خلف منشی جگن ناتھ خوشتر سے ثابت ہے :-

"جسومت نند رادھا کشن بس دیو"
۱۲۶۶ھ

اس کے بعد رامائن شروع کی گئی جس کی تاریخ خود مصنف نے کہی۔

ہوئی آغاز جب یہ نظم زیبا پئے تاریخ مجھ کو دھیان آیا
سروش غیب نے فرمایا سُن کر ریاض نور ہے "تاریخ خوشتر"

آگے چل کر امیر احمد (علوی) خوشتر کی اسی نظم کے متعلق تحریر کرتے ہیں :-

"حکایت دلچسپ، ہونہ خیز تھی، قافیے بھی چست تھے مگر تشبیہ و استعارات کے ساتھ داستان میں کامیابی نہیں ہوئی، اور سخنوروں نے اس نظم کی کچھ قدر نہ کی۔"

علوی صاحب مثنوی کو ناکام کہتے ہیں حالانکہ ان کی کامیابی کے علاوہ اور دلایل ایک بین دلیل یہ ہے کہ یہ مثنوی بارہ مرتبہ صرف مطبع منشور سے چھپی ہے۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر روانی ہے کہ جیسے ایک دریائے فصاحت الفاظ کی موجوں کو اپنے جلوس میں لئے ٹھاٹیں مارتا ہو۔ تشبیہ اور استعارات کا محل استعمال بھی نہایت موزوں اور استادانہ ہے۔ کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے مصنف کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

واجد علی شاہ کے تخلص کی رعایت سے الفاظ میں جو تشبیہات اور استعارات کا التزام رکھا گیا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے :-

مثال مہر ہے نام اُس کا روشن شہ واجد علی رشکِ تہمتن،
شہنشاہِ اودھ سلطانِ عالم بہارِ دولت بستانِ عالم
بروج خسرو تابندہ اختر بدرج نیکوئے فرخندہ گوہر
سکندر طالع و جمشید اقبال ہمایوں صورت خورشید تمثال
مجل ہے بارگہ سے اُس کی گردوں ستاروں سے سپہ ہے اُسکی افزوں
ثریا مرتبے میں اُس سے کم ہے زحل کا یہ کہاں جاہ و حشم ہے

وہ ہے تابندہ اُس کا طالع بخت — قمر ہے تاج جس کا آسماں تخت
فریدوں نے نہ پایا مرتبہ یہ — نہ تھا کاؤس دکے کا دبدبہ یہ
دفور عدل نے شاہِ جہاں کے — مٹائے ظلم پیرِ آسماں کے
ہوئے ظالم عمل میں اُسکے سب زیر — تواضع کرتا ہے روباہ کی شیر
یہ اُس کے عدل کی ہے حکم رانی — کہ رستم زال کا بھرتا ہے پانی
مخالف ڈرتے ہیں اُسکے موافق — بہم ہیں آب و آتش یارِ صادق
یہ فیضِ عدل کسریٰ میں کہاں تھا — عبث اُس کا لقب نوشیرواں تھا
کبوتر سے یہ دل ہے باز مانوس — محبت مار سے رکھتا ہے طاؤس
اماں ماہی نے زیرِ آب پائی — نہنگ شوخ نے کی آشنائی

یہی اندازِ نگارش جگن ناتھ خوشتر کی دوسری مثنوی "بھاگوت" کا ہے سبب تالیف کتاب کے ابتدائی چند اشعار پیش ہیں جن میں مصنف نے اپنی شگفتہ بیانی سے صفحۂ کاغذ پر گل کھلا کر رکھ دئے ہیں۔

سببِ تالیف کتاب مثنوی "بھاگوت":-

سحر گہ خواب سے میں اُٹھ کے اک روز — گیا سوئے چمن با سینہ پر سوز
کہ تا نظارۂ گل سے لبِ آب — دل افسردہ مثلِ گل ہو شاداب
کہوں کیا میں دمِ گلگشتِ گلشن — نظر آیا جو گلرویوں کا جوبن
معطر پیرہن پہنے تھا ہر گل — کہ جس کی بو سے دیوانی تھی بلبل
گل سنبل شگفتہ ہر چمن میں — بہم عقدِ وفا سرو و سمن میں
ہجوم قطرۂ شبنم گلوں پر — مرصع جیسے مے سے ساغرِ زر
گلِ صد برگ پر خنداں چمن تھا — کہے تو زعفرانی پیرہن تھا
گلوں پر یوں جھکی تھی شاخِ سنبل — رخِ محبوب پر جس طرح کاکل
شقائق تھا گلِ سوسن سے باہم — چمن تھا تختۂ یاقوت نیلم
بہار دل سے جو جوبن تھا گلوں پر — کھڑے تھے تاک میں سرو و صنوبر
کیا تھا زلف میں سنبل نے شانہ — نظر کرتا تھا ہر گل عاشقانہ
کلہ زلفوں پہ رکھی ناز سے کج — بنفشہ نے نکالی تھی عجب دھج

میانِ سبزہ کبک کوہساری — خراماں صورتِ ابرِ بہاری
نسیمِ گل سے پائی دل نے فرحت — برنگِ گل ہوئی خنداں طبیعت

غرض یہ کہ پوری کی پوری مثنوی بندش اور صفائی، تشبیہ و استعارات اور شگفتہ بیانی میں اپنی مثال آپ ہے۔

مثنوی نلدمن کا ذکر کرتے ہوئے علوی صاحب نگار جنوری ۵۰ء میں رقمطراز ہیں کہ:- "اسی زمانہ کے لکھنؤ کے ہندو شاعر راحت یا نے نلدمن فیضی کا خلاصہ اُردو میں کیا لیکن مصنف کا صحیح نام معلوم نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تاج بہادر تاج کی تصنیف ہے۔ اور کوئی راحت نس کرتا ہے۔ داستان مشہور لیکن داستان گو گمنام ہو گیا۔"

جس راحت کو علوی صاحب گمنام کہتے ہیں اس کا نام بھگونت رائے ہے آپ کا نام دین دیال باشندگانِ کاکوری نواح لکھنؤ

۷ - اس مثنوی کو شاہ نصیر کے شاگرد نکہت نے بھی نظم کیا ہے۔

احوال معہ حال صاحب کلاں سلیمن صاحب ریزیڈنٹ لکھنؤ :-

فلک پر سر جنگ ہے اندنوں ــــ زمانے سے دل تنگ ہے اندنوں
کہیں دل کو آرام ملتا نہیں ــــ کہ شیشے سے اب جام ملتا نہیں
کوئی عہدِ دولت میں غمگیں نہ تھا ــــ کوئی آدمی ناتواں ہیں نہ تھا

اُٹھائیں تھیں حضرت نے بیماریاں ــــ مثالِ گلِ نرگسِ بوستاں
کوئی فصل مسہل سے خالی نہ تھی ــــ بصحت مگر طبع عالی نہ تھی
اطبا نے ہر چند تدبیر کی ــــ نہ بدلی مگر شکل تقدیر کی
حوالے تھے نواب کو کام سب ــــ اُسی کی زباں پر تھے احکام سب
یہاں تک تھی اُس پر عنایات شہ ــــ کہ تھا اختیارِ سفید و سیاہ
رضا جوئے شہ تھا وہ شام و سحر ــــ وہ تھا خیر خواہِ شہ دادگر
بظاہر تو اُس کا یہ احوال تھا ــــ مگر حالِ دل سے ہے واقف خدا
رہا دس برس تک اُسے اختیار ــــ عیاں ہے ہوا جو کچھ انجام کار

تحریر صاحب کلاں بہ شکایت شاہِ اودھ بحضور نواب گورنر جنرل بہادر :-

کسلمند ہے شاہِ عالی وقار ــــ وزیر الممالک کو ہے اختیار
قلمرو میں دورے پہ جب میں گیا ــــ تو دیکھا عجب حال ہر ایک کا
جو عامل کی ہے بادشاہی وہاں ــــ تو کرتا ہے ناظم خدائی وہاں
امیر اس طرح کے ہیں بیدادگر ــــ فقیروں سے بھی چھین لیتے ہیں گھر
کئے اہلِ دربار نے یہ ستم ــــ دئے ایک درویش[۱] نے لاکھ غم
عجب واقعہ مولوی[۲] کا ہوا ــــ کہ دل چاک ہر آدمی کا ہوا

گئے سوئے لندن لفافے اِدھر ــــ چلے لکھنؤ کی طرف نامہ بر
سنا تھا جو مضمونِ تجویز[۳] کا ــــ وہ کلکتہ والوں نے پیہم لکھا
تواتر جو یوں نامے آنے لگے ــــ تو نواب کو سب بنانے لگے
جواب اُن کو دے کردہ خطاے لئے ــــ ہدف کی طرح نامے رکھوا دئے
لگائیں غرض گولیاں پانچ سات ــــ نشانہ بنا کر[۴] اُڑا دی یہ بات

---

[۱] کفایت اللہ شاہ - [۲] مولوی امیر علی - [۳] تجویز معزولی شاہ - [۴] اندنوں نواب تیراندازی سیکھنے میں مشغول تھا۔

تضارا کوئی خط گیا شاہ تک　　بشر سے کہ پہونچا کے آیا ملک
وہ خط پڑھ کے تشویش پیدا ہوئی　　پریشانئی دل ہویدا ہوئی
بلایا اُسی وقت دستور کو　　کہا نامہ دے کر اسے تو پڑھو
جہاں پاں سے دستور نے عرض کی　　کہ قدمی کو پہلے خبر آچکی
یہ شہدوں نے لکھ لکھ کے بھیجے ہیں خط　　ملے کچھ انھیں یہ غرض ہے فقط
یہ سُن کر ہوا دور اندوہ شاہ　　رہے شغل شاہانہ شام و پگاہ

مثنوی کے آخری دو شعر :-

لکھی میں نے جس روز تک یہ کتاب　　اُسی باغ میں تھے سلیماں جناب
اب آگے نہیں علم ہوتا ہے کیا　　لکھوں گا مگر میں جو زندہ رہا

صفیر لکھنوی نے ایک مثنوی موسومہ "آئینِ اختری" ۱۲۷۶ھ میں لکھی اس میں واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے حالات اور غدر کے دردناک واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اسی مثنوی کا ایک نامکمل مطبوعہ نسخہ پٹنہ لائبریری میں ہے، راقم الحروف کے پاس مکمل ہے اور غیر مطبوعہ، یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے باوجود انگریزی دور اقتدار ہوتے ہوئے نہایت نڈر اور بیباکانہ طریقہ پر اُن دردناک واقعات کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جو غدر کے زمانہ میں بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر اور بزمِ تیموری کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کو پیش آئے اگرچہ بادشاہ ظفر کا حال اس میں ضمناً ہے لیکن جس قدر بھی ہے تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ مصنفِ "آئینِ اختری" انیس الدولہ کے متوسلین میں سے ہے، انیس الدولہ سے تعلق قایم ہوئے ابھی صرف چار سال ہی ہوئے تھے کہ زمانہ نے کروٹ بدلی اور ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا۔

کھنچا طولِ امیدواری کمال　　سمندِ توقع ہوا چارہ سال
مگر سالِ پنجم ہوا جب شروع　　کیا امرِ تقدیر نے یوں وقوع
کہ رنگِ زمانہ دگرگوں ہوا　　غم آگیں دلِ پیرِ گردوں ہوا
پئے سلطنت آگیا انقلاب　　میانِ کسوف آگیا آفتاب
دلِ مضطرب غم سے تھرّا گیا　　کہ اکبار سب پر ضرر آگیا
اس آفت سے اک ایک کو غم ہوا　　کہوں کیا وہ میرا جو عالم ہوا
عجب وقت تھا رنج کا وہ بھی آہ　　کہ یوں مٹ گئی حیف سرکارِ شاہ

کتاب کا تاریخی نام :-

یہی اور ناموں سے بہتر ہے نام　　کہ تاریخ آئینِ اختر ہے نام

اسی موضوع پر ایک دوسری مثنوی آفتاب الدولہ قلق نے "سفرِ آشوب" لکھی اس کا زمانہ تصنیف واجد علی شاہ کی رہائی کے کچھ بعد کا ہے۔ جس کا ذکر مفصل طور پر قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر پٹنہ، جولائی ۱۹۶۰ء میں کیا ہے، پہلا بند

لہ منور الدولہ کی تدبیر سے یہ خط بادشاہ تک پہونچا۔

مثنوی "سفرِ آشوب" کا یہ ہے :-

دھوم ہے شہر میں وارفتۂ اختر آیا — خوشنماؤں میں یہ چرچا ہے کہ کیونکر آیا
شاد آیا ہے چلو دیکھیں کہ مضطر آیا — اور کوئی مژدۂ جاں بخش بھی لے کر آیا

کچھ کریں فکرِ علاجِ غمِ دردِ محن آج
پوچھیں حالِ سفرِ شاہِ غریب الوطن آج

"نگار" فروری ۵۸ء میں منشی امیر اللہ تسلیم کی تین مثنویوں کا ذکر کیا گیا، لیکن تذکروں سے اُن کی آٹھ مثنویوں کا پتہ چلتا ہے چار مثنویاں تو راقم الحروف کے پاس ہیں جن کے نام یہ ہیں :- (۱) نالۂ تسلیم - (۲) شامِ غریباں - (۳) صبحِ خنداں - (۴) تاریخ رام پور۔ تاریخ رامپور کے کچھ اشعار یہ ہیں :-

جگر خستہ تسلیم خانہ خراب — جسے کہتے ہیں سب غلامِ جناب
اُٹھاؤں دمِ فکرِ مضموں رقم — کروں مدحِ کلب علی خاں رقم
نہ چھوڑوں قدم ظلِ سبحاں کے میں — فلک رتبہ کلب علی خاں کے میں
پلا مجھ کو ساقی کوئی جامِ مے — کہ ہوں آج ہم بزم کاؤس و کے
زِ موجِ مے سے جو تر ہو زباں — لکھوں حالِ سردار داؤد خاں

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن
کی
ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے
حرفِ آخر
کپور سپن
KAPUR SPUN
ہی ہے
تیار کردہ - کپور سپننگ ملز - ڈاک خانہ راین اینڈ سلک ملز - امرت سر

عہدِ مغلیہ کے شاہی خزانے کے جواہرات

(سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

فارسی تاریخوں میں عہدِ وسطیٰ کے مسلمان بادشاہوں کے سلسلہ میں جواہرات کا ذکر بھی جا بجا آیا ہے۔ مثلاً سلطان معز الدین کیقباد نے ایک بار جشن نوروز منایا تو جشن گاہ میں پانچ چتر لگائے، ایک سیاہ چتر جس میں غیر معمولی نقش و نگار بنے تھے۔ اس میں موتی اس طرح لٹکے ہوئے نظر آتے تھے جیسے سیاہ ابر سے بوندیں پڑ رہی ہوں۔

سلاطین دہلی میں سب سے زیادہ جواہرات سلطان علاء الدین خلجی کے پاس تھے۔ وہ دیوگیر کی مہم سے واپس آیا تو مشہور مورخ فرشتہ کے بیان کے مطابق وہ اپنے ساتھ چھ من سونا، سات من موتی، دو من ہیرا، لعل، یاقوت اور زمرد، ایک من چاندی اور چار ہزار تھان ریشمی کپڑے لایا۔[1] تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی نے اس دولت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی، دیوگیر سے اتنا سونا، چاندی، جواہرات، موتی اور عمدہ کپڑے لایا کہ سلاطین کی فضول خرچیوں کے باوجود فیروز شاہ تغلق کے زمانہ تک خزانے میں جواہرات اور موتی موجود تھے۔[2]

جب شاہی محل میں کسی شادی کی تقریب انجام پاتی تو اس موقع پر دولھا اور دُلھن کو جو کپڑے اور خلعت دئے جاتے ان میں بکثرت جواہرات ٹکے رہتے۔ سلطان محمد تغلق نے اپنی بہن کا نکاح امیر سیف الدین سے کیا تو امیر کو ایک خلعت دیا گیا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ خلعت میں اس قدر جواہرات ٹکے ہوئے تھے کہ کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں دُلھن لاکر بٹھائی گئی تھی وہ دیبا سے منڈھا ہوا تھا اور اس پر بھی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔[3]

اُس زمانہ میں سونے کی اتنی فراوانی تھی کہ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد میں قلعہ کے اندر ایک بڑا محل بنوایا تو اس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جس وقت سورج طلوع ہوتا تھا تو اس محل کی چمک دمک سے کوئی شخص اس کی طرف نظر جما کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ محل کے نقیب کے ہاتھ میں ایک طلائی چھڑی ہر وقت رہتی تھی۔ اس کے سر پر جڑاؤ اور طلاکار کلاہ ہوتی۔ باقی نقیبوں کی کمر میں زریں کمربند، سر پر طلاکار شاشیہ اور ہاتھ میں تازیانہ ہوتا تھا۔ دربار سجایا جاتا تو پہلے دیوان خانہ کے صحن میں ایک بارگاہ کھڑی کی جاتی۔ یہ ایک بہت بڑا خیمہ ہوتا جو بہت سے کھمبوں پر کھڑا کیا جاتا۔ وہاں ایک سونے کی چوکی لاکر رکھی جاتی اس پر ایک گدّا ہوتا جس پر رومال پڑا ہوتا۔ پھر دیوان خانہ کے صدر میں ایک بڑا تخت رکھا جاتا جو سونے کا ہوتا تھا۔ اس میں جواہرات جڑے ہوتے تھے تخت کے اوپر ایک کرسی بچھائی جاتی تھی اور بادشاہ کے سر پر چتر ہوتا تھا۔ کوتوال کے ہاتھ میں سونے کا ایک عصا ہوتا اور اس کے نائب کے ہاتھ میں چاندی کی چھڑی رہتی۔ عید یا اور تہواروں کے موقع پر غلاموں کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے گلاب پاش ہوتے جو حاضرین پر گلاب اور پھولوں کے عرق چھڑکتے رہتے۔[4] عید کے دن سلطان کی خدمت امراء سونے کے تھالوں میں نذرانے پیش کرتے۔ اس روز ایک بڑی انگیٹھی بھی باہر نکالی جاتی جو برج کی شکل کی خالص سونے کی بنی ہوتی تھی۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۹۲ [2] تاریخ فیروز شاہی از برنی، ص ۳۲۳ [3] سفرنامہ ابن بطوطہ، اردو ترجمہ۔ ص ۱۳۳ [4] سفرنامہ ابن بطوطہ۔ ص ۱۰۸۔

شاہی سواری کے ہاتھی کے اوپر جو چتر لگایا جاتا، وہ خالص سونے کا ہوتا اور ہاتھی پر جو گدا رکھا جاتا اس میں جواہرات لگے ہوتے[1] شاہی محل کے کھانے پینے کے ظروف بھی سونے اور چاندی کے ہوتے ۔ تلواروں کے نیام اور ترکش میں بھی سونا ہوتا ۔ علماء اور فقہا کے نزدیک ان چیزوں کا استعمال چونکہ شرعاً ناجایز تھا اس لئے فیروز شاہ تغلق نے ایسے ظروف اور اسلحہ کا استعمال ممنوع قرار دیدیا تھا۔[2]

مغل بادشاہوں کے خزانے میں تو جواہرات کی اور بھی کثرت رہی ۔ اکبر جب مرا تو اس کے خزانے میں گیارہ سے چودہ ماشے تک کی دس کرور اشرفیاں تھیں ۔ سو تولے سے پانچ سو تولے تک کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں ۔ سونا ۲۷۲ من ، چاندی ۳۷۰ من اور جواہرات ایک من تھے ۔ ان جواہرات کی قیمت تین کرور روپے سے زیادہ تھی[3] مغل بادشاہوں کے پاس جو قیمتی جواہرات تھے ان میں سے چند خاص جواہرات کی کچھ تفصیل آیندہ سطروں میں ملے گی ۔

ہیرے بابر کو ایک بڑا ہیرا گوالیار کے راجہ بکرماجیت کی اولاد سے ملا تھا ۔ اُس کے بارے میں وہ اپنی تزک (اردو ترجمہ ص ۶۸) میں لکھتا ہے :-

"جب ہمایوں، آگرہ آیا تو بکرماجیت کی اولاد بھاگنے کے خیال میں تھی ۔ ہمایوں نے سپاہی متعین کر دئے تھے مگر انھیں لوٹنے اور مارنے کی اجازت نہ دی تھی (بکرماجیت کی اولاد نے) اپنی خواہش سے بہت سے جواہرات ہمایوں کو نذر کئے ۔ اس میں ایک مشہور ہیرا تھا جو سلطان علاء الدین لایا تھا ۔ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کی قیمت ساری دنیا کے خرچ کا نصف تشخیص کی تھی ۔ غالباً آٹھ مثقال (یعنی ۲۱۶ رتی) کا تھا جب میں آیا تو ہمایوں نے اس ہیرے کو پیش کیا لیکن میں نے ہمایوں ہی کو دیدیا"

کہا جاتا ہے کہ یہی ہیرا کوہ نور کے نام سے مشہور ہوا جس کو نادر شاہ لوٹ کر ایران لے گیا ۔ لیکن پھر چکر کھاتا ہوا رنجیت سنگھ کے پاس لاہور پہونچا اور وہاں سے انگریزوں نے ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجدیا اور اب تاج برطانیہ میں لگا ہوا ہے ۔ لیکن کچھ ارباب نظر کا خیال ہے کہ یہ ہیرا کوہ نور نہیں تھا بلکہ کوہ نور وہ ہیرا کہلایا جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ نے شاہ جہاں کو دیا تھا اور اُس کا وزن نو ٹانک یعنی ۲۱۶ رتی تھا ۔ اس کا ذکر آگے آئے گا ۔

اکبر کے پاس ۵½ ٹانک اور چار سرخ کا ایک ہیرا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی[4] شہزادہ سلیم نے اکبر کو اسی قیمت کا ایک ہیرا نذرانہ میں دیا تھا[5] جہانگیر کے بارھویں سال جلوس میں مقرب خاں نے گجرات سے اس کو ایک ہیرا بھیجا جس کا وزن ۲۳ سرخ تھا ۔ اس کی قیمت ۳۰ ہزار روپے تھی ۔ جہانگیر نے اپنے لئے اس کی ایک انگوٹھی بنوائی ۔ اسی سال شہزادہ خرم نے جہانگیر کو جو نذرانے پیش کئے ان میں صرف جواہرات کا ذکر جہانگیر نے اپنی تزک میں (ص ۱۹۹) پر کیا ہے :-

"ایک نفیس لعل ہے جس کو اس فرزند نے گوا میں ایک لاکھ روپے میں خریدا ۔ اس کا وزن نو سے ٹانک ہے جو سترہ مثقال اور ۵½ سرخ کے برابر ہے ۔ میری سرکار میں کوئی لعل بارہ ٹانک سے زیادہ نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نیلم ہے جس کو عادل خاں نے شہزادہ کو دیا تھا ۔ اس کا وزن چھ ٹانک اور سات سرخ ہے اور اس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہے اس سے پہلے اتنا بڑا نفیس، خوش رنگ اور شاداب نیلم دیکھنے میں نہیں آیا ۔ ایک دوسرا تحفہ جکورہ نامی ہیرا ہے جو عادل خاں کے یہاں سے ملا ۔ اس کا وزن ایک ٹانک اور چھ سرخ ہے اور اس کی قیمت چالیس ہزار روپے ہے ۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ دکن میں جکورہ ایک قسم کا ساگ ہوتا ہے ۔ مرتضیٰ نظام الملک نے برار کو فتح کیا تو ایک روز وہ اپنے حرم کے ساتھ ایک باغ کی سیر کر رہا تھا ۔ وہاں ایک عورت نے جکورہ ساگ کے اندر یہ ہیرا پایا اور نظام الملک کو دیا ۔ اس

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۔ [2] فتوحات فیروز شاہی ۔ ص ۱۳ ۔ [3] منتخب اللباب جلد اول از خافی خاں ص ۲۴۳ ۔ [4] آئین اکبری جلد اول آئین ۳ ۔ [5] اکبر نامہ جلد سوم ص ۸۳۲ ۔ [6] تزک جہانگیری ص ۱۸۶

روز سے اس کلام الماس جکورہ (جکورہ ہیرا) پڑ گیا۔ پھر یہ احمد نگر کے حکمراں ابراہیم عادل خاں کے تصرف میں آگیا تھا۔ ایک اور تحفہ زمرد ہے۔ یہ بھی عادل خاں سے ملا۔ یہ ایک نئی کان سے نکلا تھا۔ بہت ہی خوش رنگ اور نفیس ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ایک اور تحفہ موتیوں کا تھا۔ ایک کا وزن ۴۴ سرخ (دو مثقال گیارہ سرخ تھا۔ اس کی قیمت پچیس ہزار روپے ٹھہری۔ دوسرے کا وزن ۱۶ سرخ تھا۔ بہت ہی چمکدار اور لطیف تھا۔ اس کی قیمت ۱۲ ہزار روپے لگائی گئی۔ ایک اور ہیرا ہے جو قطب الملک سے ملا۔ اس کا وزن ایک ٹانک تھا۔ اس کی قیمت تیس ہزار روپے ٹھہری[1]۔

جہانگیر کے جلوس کے تیرھویں سال شہزادہ خرم نے اس کو جو تحایف بھیجے ان میں ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی۔ اس کی قیمت ایک ہزار مُہر تھی۔ ہیرے میں تین حروف لکھے تھے جن کو غور سے دیکھنے کے بعد "سعد" پڑھا جاتا تھا۔ جہانگیر نے شہزادہ خرم کی خواہش کے مطابق ایران کے بادشاہ شاہ عباس کو اور تحایف کے ساتھ بھیج دی[2]۔ اسی سال اس کو ایک ایسا ہیرا ملا جو نیلم کی طرح تھا۔ اس رنگ کا ہیرا دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کا وزن ۳۰ رتی تھا۔ جوہریوں نے اس کی قیمت تیس ہزار لگائی تھی[3]۔

جہانگیر کی تخت نشینی کے چودھویں سال شاہ جہاں نے جو نذرانے پیش کئے ان میں ایک ہیرے کی قیمت اٹھارہ ہزار روپے تھی۔ ان تحایف میں ایک خوش رنگ اور آبدار یاقوت بھی تھا جس کا وزن ۲۲ سرخ تھا اور اس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی۔ چھ دانے موتی کے تھے جو اٹھاون ہزار روپے میں خریدے گئے تھے[4]۔

مغل بادشاہوں میں جواہرات کا سب سے بڑا قدر داں شاہ جہاں تھا۔ وہ ہر قسم کے جواہرات جمع کرتا رہا۔ فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان ہے کہ شاہجہاں سے زیادہ جواہرات شاید ہی دُنیا کے کسی اور بادشاہ کے پاس ہوں۔ شائستہ خاں نے ۱۰۵۵ھ میں اس ایک بہت بڑا ہیرا دیا۔ جس کا وزن ۱۱۶ رتی تھا اور قیمت ایک لاکھ روپے تھی[5]۔ یہی ہیرا شاہ جہاں نے دارا شکوہ کو دیا[6]۔ شاہ جہاں کو ۱۰۵۰ھ میں بیجاپور کے قطب الملک سے بھی ایک بہت بڑا ہیرا ملا جو تراشنے سے پہلے ۱۸۰ رتی کا تھا۔ اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی شاہجہاں نے اس کو اور جواہرات کے ساتھ ایک شمع دان میں لگایا اور مدینہ منورہ روضہ پاک کے لئے بطور تحفہ بھیجدیا۔ اس شمعدان کی قیمت ڈھائی لاکھ روپے تھی۔ میر جملہ نے ۱۰۶۶ھ میں شاہ جہاں کو ایک بڑا ہیرا دیا جو وزن میں ۹ ٹانک یعنی ۲۱۶ رتی تھا اور اس کی قیمت دو لاکھ سولہ ہزار روپے تھی۔ برنیر نے اس ہیرے کے متعلق لکھا تھا کہ یہ مقدار اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے[7]۔ یہی ہیرا آگے چل کر کوہِ نور کہلایا جسے نادر شاہ ہندوستان سے لوٹ کر ایران لے گیا۔ لیکن یہ پھر ہندوستان واپس آیا اور رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا اور اب انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ اس کی قیمت بے اندازہ لگائی جاتی ہے۔

میر جملہ جب گولکنڈہ کے حکمراں کا وزیر تھا تو ہیروں کی کانوں کا ٹھیکہ لیا کرتا تھا۔ ان کانوں کی کھدائی غیر معمولی مشقت اور محنت سے کی جاتی۔ میر جملہ کے پاس ہیروں کی اتنی کثرت تھی کہ وہ ان کا شمار نہ کرتا تھا بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی ٹاٹ کی تھیلیوں کو گنوا لیتا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے چوالیسویں سال جلوس میں اس کو بھی ایک ہیرا دیا تھا جس کی قیمت پچھتر ہزار روپے تھی۔ اسی سال دانشمند خاں نے بھی اس کو نذرانے میں ایک ہیرا دیا جو پچاس ہزار روپے کا تھا[8]۔

ہیرے کی کانیں زیادہ تر گولکنڈہ اور بیجاپور میں تھیں۔ ایک کان گولکنڈہ سے پانچ منزل پر راؤل کنڈہ میں تھی۔ دوسری کان کو لور گولکنڈہ سے پورب کی طرف سات منزل پر واقع تھی۔ بنگال میں گویل ندی کی ریت میں سے بھی ہیرے نکلتے تھے۔ بہار میں کھوکرہ میں سے ہیرا

---

[1] تزک جہانگیری۔ ص ۲۳۱ - [2] تزک جہانگیری۔ ص ۲۴۶ - [3] تزک جہانگیری۔ ص ۲۶۷ - [4] بادشاہ نامہ جلد دوم۔ ص ۴۸۰ - [5] بادشاہ نامہ جلد سوم ۱۰۵۵ھ - [6] مآثر الامرا جلد سوم۔ ص ۳۵ - [7] سفر نامہ برنیر اردو ترجمہ ص ۳۸ - [8] تفصیل کے لئے دیکھئے امپیریل ٹریژری آف دی انڈین مغلز از عبدالعزیز ص ۱۸۲ - [9] عالمگیر نامہ ۶۳۲ -

ہوا کرتا تھا - ایک کان گونڈوانہ (خاندیس) میں بھی تھی[1] - پنہ، سمبل پور، اور ویراگڑھ میں بھی اس کی کانیں تھیں -

لعل اکبر کی ماں حمیدہ بیگم کے پاس ایک لعل تھا جس کا وزن ۹ ٹانک اور ۵ سرخ تھا - اس کی قیمت سوا لاکھ روپے تھی - جہانگیر کی پیدائش کے موقع پر اس نے یہ لعل اکبر کو دیا - اکبر اس کو اپنی سرپیچ میں لگائے رہتا تھا - جہانگیر نے بھی اس کو ایک مدت تک اپنے سرپیچ میں استعمال کیا - اکبر کے پاس ایک دوسرا لعل تھا جو گیارہ ٹانک ۲۰ سرخ یعنی ۲۸۴ رتی کا تھا اور اس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی[2] - ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ بھتہ (ریوا) کے راجہ رام چندر نے اکبر کو تحایف بھیجے تو ان میں ایک بڑے لعل کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی[3] - شہزادہ دانیال نے ایک بار اکبر کے لئے ایک لعل بھیجا تھا جس کا وزن ۴ مثقال یعنی ۱۰۴ رتی تھا۔

جہانگیر نے اپنے سال جلوس میں شہزادہ پرویز کو ایک لعل دیا جس کی قیمت پچیس ہزار روپے تھی[5] - اسی سال اس نے ایک دوسرے موقع پر پرویز کو موتیوں کے سو دانے کے ساتھ چار لعل بھی دئے اور جب ۱۰۱۶ھ میں آصف خاں وزارت کے عہدہ پر مامور ہوا تو اس نے جہانگیر کو ایک لعل نذرانے میں پیش کیا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی[8] - جہانگیر کے دوسرے سال جلوس میں اس کو ایک لشکری نے ایک ایسا لعل نذرانے میں پیش کیا جس کا رنگ پیازی تھا[9] - اسی سال گجرات سے اس کو مرتضیٰ خاں نے ایک انگوٹھی بھیجی جو ایک قطعہ لعل سے بہت ہی خوش رنگ اور خوش آب بنائی گئی تھی - جہانگیر کے تیسرے سال جلوس میں خانخاناں عبدالرحیم خاں نے اس کو نذرانے پیش کئے ان میں موتیوں کی دو تسبیحوں اور زمرد کے علاوہ چند لعل بھی تھے - ان کی مجموعی قیمت تین لاکھ روپیہ تھی[10] - اسی سال بنگال کے دیوان وزیر خاں نے اور تحایف کے ساتھ ایک قطعہ لعل قطبی بھی پیش کیا[11] - اسی سال آصف خاں نے بھی ایک لعل نذرانے میں دیا، جس کو اس کے بھائی ابوالقاسم نے کھمبایت میں پچھتر ہزار روپے میں خریدا تھا۔

جہانگیر نے اپنے چوتھے سال جلوس میں اس نے شہزادہ پرویز کو ایک لعل دیا جس کی قیمت ساٹھ ہزار روپے تھی اور شہزادہ خرم کو دو موتیوں کے ساتھ ایک لعل بھی دیا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی[12] - جہانگیر کو اپنے دسویں سال جلوس میں رانا امر سنگھ سے بھی ایک لعل ملا جس کی قیمت ساٹھ ہزار روپے تھی - اس کا وزن آٹھ ٹانک تھا - امر سنگھ نے اس لعل کے ساتھ ایک بلوریں صندوقچہ چند قطعے زمرد، تین انگوٹھیاں اور چار راس عراقی گھوڑے بھی پیش کئے تھے جن کی مجموعی قیمت اسی ہزار روپے تھی[13]۔

جہانگیر کے گیارھویں سال جلوس میں دیانت خاں نے اس کو دو تسبیحیں، ایک لعل، موتی کے چھ بڑے دانے اور ایک طلائی خوانچہ پیش کیا جس کی مجموعی قیمت ۲۸ ہزار روپے تھی[14] - اسی سال جہانگیر اپنے خسر اعتماد الدولہ کے گھر گیا تو اعتماد الدولہ نے نذرانے میں دانے موتی (قیمت تیس ہزار روپے) ایک قطعہ لعل قطبی (قیمت بیس ہزار روپے) اور دوسرے جواہرات پیش کئے جن کی مجموعی قیمت ایک لاکھ دس ہزار روپے تھی[15] - اسی موقع پر اعتماد الدولہ کے لڑکے اعتبار خاں نے بھی قیمتی جواہرات و پارچہ جات پیش کئے جن کی قیمت باون ہزار روپے تھی[16] - اسی سال شہزادہ خرم نے جہانگیر کو ایک لعل نذرانے میں دیا جس کی قیمت اسی ہزار روپیہ تھی، اس میں بڑی آب و تاب و چمک تھی[17] - اپنے بارھویں سال جلوس میں خود جہانگیر نے شہزادہ خرم کو ایک لعل دیا جس کی قیمت تیس ہزار روپے تھی[18] - اسی سال مہابت خاں نے جہانگیر کی خدمت میں ایک لعل گزرانا جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی[19] - اور جب شہزادہ خرم اسی سال دکن کی فتح کے بعد واپس ہوا تو اس نے ایک لعل جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا جس کو اس نے گوآ کی بندرگاہ میں دو لاکھ روپے میں خریدا تھا - اس کا وزن ۱۹½ ٹانک

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۲۳۸ - [2] تزک جہانگیری، ص ۲۰۴ - [3] آئین اکبری جلد اول آئین ۳ - [4] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۲۵ - [5] اکبر نامہ جلد سوم ۷۱۰ - [6] تزک جہانگیری، ص ۳۸ - [7] تزک جہانگیری، ص ۳۸ - [8] تزک جہانگیری، ص ۵۱ - [9] تزک جہانگیری، ص ۵۷ - [10] تزک جہانگیری ص ... تزک جہانگیری، ص ۱۷ - [11] تزک جہانگیری، ص ۱۷ - [12] تزک جہانگیری، ص ۱۷ - [13] ایضاً - [14] ایضاً - [15] تزک جہانگیری، ص ۱۴۰ - ایضاً، ۱۵۱ - [16] ایضاً ص ۱۹۰ - [17] ایضاً ص ۱۹۶ -

(۷ اشقال اور ½ ۵ سرخ) تھا۔ جہانگیر اس کے بارہ میں لکھتا ہے کہ اس سے بڑا لعل میرے پاس پہلے موجود نہ تھا[1]۔ اس موقع پر شہزادہ خرم نے نورجہاں کو بھی ایک لعل دیا جس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی[2]۔

جہانگیر کے چودھویں سال جلوس میں شہزادہ خرم نے باپ کو ایک لعل قطبی دیا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی[3]۔ اسی سال جہانگیر کو آصف خاں نے اپنے گھر پر مدعو کیا تو اس کو ایک لعل نذرانہ میں دیا جس کا وزن ½ ۱۲ ٹانک (یعنی ۳۰۰ رتی) تھا اور ایک لاکھ پچیس ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں ایران کے شاہ عباس نے اس کو ایک لعل بھیجا جس کا وزن ۱۲ ٹانک تھا اور اس پر "الغ بیگ بن میرزا شاہ رخ بہادر بن امیر تیمور گورگان" کندہ تھا۔ خود شاہ ایران نے اس پر خط نستعلیق میں اپنا نام "بندہ شاہ ولایت عباس" لکھوا دیا تھا۔ اس لعل کو جہانگیر نے شہزادہ خرم کو تسخیر دکن کی خوشی میں دیا۔ شاہ جہاں نے اپنے عہد حکومت میں اسے تخت طاؤس میں لگا دیا[4]۔ اس لعل کی قیمت ایک لاکھ روپے قرار پائی تھی۔ جہانگیر کے جلوس کے اٹھارھویں سال اس کے ایک درباری امیر نے پیش کش میں اس کو ایک لعل دیا جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی[5]۔

یہ تمام لعل شاہ جہاں کو جہانگیر سے وراثتاً شاہی خزانے میں ملے تھے۔ مگر اس کے عہد میں سب سے بڑا لعل وہی تھا جو اس کے لئے گوا میں خریدا گیا تھا اور جس کا وزن ½ ۱۰ ٹانک تھا۔ اس کی تعریف بادشاہ نامہ کے مصنف نے دل کھول کر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جواہرات میں چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے (۱) رنگ بہت ہی عمدہ ہو لیکن لعل کا رنگ گہرا لال یعنی مایل بہ سیاہی نہ ہو اور نہ شفتالو کے رنگ کی طرح ہو۔ (۲) شفافی و بے جرمی۔ یعنی اس میں بڑی آب و تاب ہو اور کوئی نقص نہ ہو۔ (۳) خوش اندامی یعنی دیدہ زیب ہو۔ (۴) کلانی سنگینی یعنی بڑا اور سنگین ہو یہ تمام چیزیں مذکورۂ بالا لعل میں پائی جاتی ہیں۔ اس لعل کو چار اور لعل کے ساتھ شاہ جہاں نے اپنی سرپیچ میں لگا رکھا تھا[6]۔

شاہ جہاں جھوٹے اور سچے جواہرات کو بڑی آسانی سے پرکھ لیتا تھا۔ ایک بار عمدۃ الملک جعفر خاں نے ایک لعل پچانوے ہزار روپے میں خریدا۔ شاہ جہاں نے اس کو دیکھا تو اس کی قیمت پانچ ہزار روپے لگائی اور یہی قیمت صحیح قرار پائی[7]۔

اورنگ زیب کو بخارا اور بصرہ سے بھی تحفہ میں لعل ملتے رہے۔ شاہ بخارا کی طرف سے اس کو جو رنگین اور خوش آب لعل ملا تھا اس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی[8] اور بصرہ سے جو لعل آیا تھا اس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی[9]۔ بیجاپور سے بھی اس کو ایک لعل ملا تھا جو وزن میں ۔۔ ٹانک اور پانچ سرخ تھا۔ اس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی[10]۔

نیلم عادل خاں بیجاپوری نے جہانگیر کو اس کے بارھویں سال جلوس میں ایک نیلم بھیجا جو وزن میں چھ ٹانک اور سات سرخ (یعنی ۱۶۵ رتی) تھا اس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ اتنا بڑا نفیس، خوش رنگ اور شاداب نیلم کبھی پہلے نظر سے نہیں گزرا[11]۔ جہانگیر کو اعتماد الدولہ نے اس کے تیرھویں سال جلوس میں ایک نیلم دیا تھا جس کی نفاست جہانگیر کو بہت پسند آئی تھی۔ اورنگ زیب کے خزانے میں موتیوں اور نیلم کا ایک ہار تھا۔ ہر موتی دس دس بارہ بارہ رتی کا تھا۔ بیچ میں ایک نیلم تھا جس کا وزن ۴۰ رتی تھا۔

زمرد اکبر کے پاس ایک زمرد تھا جس کا وزن ½ ۱۰ ٹانک اور تین سرخ (یعنی ۲۴۹ رتی) تھا۔ ابوالفضل نے اس کی قیمت باون ہزار لکھی ہے[12]۔ جہانگیر کے بارھویں سال جلوس میں عادل شاہ بیجاپوری نے دوسرے تحایف کے ساتھ ایک زمرد بھی بھیجا تھا جس

---

۱ ایضاً ص ۱۹۹ - ۲ بادشاہ نامہ جلد دوم، ص ۵-۷ - ۳ ایضاً ص ۲۶۶ - ۴ بادشاہ نامہ جلد اول ص ۸۰ - تزک جہانگیری، ص ۲۷۲
۵ بادشاہ نامہ - ۶ سفرنامہ برنیر - ۷ عالمگیر نامہ ۴۳۸ - ۸ مآثر عالمگیری، ص ۸۲ - ۹ ایضاً ص ۸۲ - ۱۰ تزک جہانگیری ص ۱۹۹
۱۱ ایضاً ص ۲۳۹ - ۱۲ آئین اکبری جلد اول آئین ۳۔

ے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ اتنا خوش رنگ اور نفیس زمرد دیکھنے میں نہیں آیا[۱]۔ اس کے تیرھویں سال جلوس میں راجہ بکرماجیت نے اس کو زمرد ایک مالا پیش کیا جس کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ اورنگ زیب کے خزانے میں لعل اور زمرد کا ایک ہار تھا جس میں صرف زمرد کا وزن ۔ رتی تھا[۲]۔

یاقوت اکبر کے شاہی خزانے میں چار ٹانک اور ۳/۴، سرخ (۱۰۳ ۳/۴ رتی) کا ایک یاقوت تھا۔ اس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی[۳]۔ یاقوت عموماً مرصع خنجر اور انگوٹھی میں جڑا ہوتا۔ میر جمال الدین حسینی نے جہانگیر کو اس کے تیرھویں سال جلوس میں جو نذرانے دئے ں میں ایک مرصع خنجر بھی تھا۔ اس پر ایک قیمتی یاقوت جڑا تھا۔ اس لئے خنجر کی قیمت پچاس ہزار روپے ہو گئی تھی[۴]۔ اسی سال شہزادہ خرم نے انگیر کو ایک یاقوت دیا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے۔ بیجاپور کے حکمراں قطب الملک سے شاہ جہاں نے یاقوت کی ایک انگوٹھی لی تھی جس کی ت پچاس ہزار روپے لگائی گئی تھی[۵]۔

موتی مغل بادشاہوں کے شاہی خزانے میں سچے اور قیمتی موتیوں کی بڑی کثرت تھی۔ اکبر کے پاس ایک موتی تھا جس کا وزن پانچ ٹانک (۱۲۰ رتی) تھا اور اس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی[۶]۔ جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں موتی بکثرت جمع ہو گئے ۔ جہانگیر کے بارھویں سال جلوس میں مقرب خاں نے احمد آباد سے لاکر اس کو ایک موتی نذرانے میں دیا تھا اور اس ایک موتی کی قیمت ہزار روپے لگائی گئی تھی[۷]۔ نورجہاں نے ترکی کے ایک تاجر سے دو موتی خریدے تو ان کی قیمت ساٹھ ہزار روپے ادا کی۔ ایک کا وزن مثقال تھا اور دوسرا اس سے کچھ ہی کم تھا۔ اس کو موتیوں اور جواہرات کا کچھ ایسا شوق رہا کہ اس نے سونے کی ایک چق بنوائی جس میں یاقوت اور زمرد کے علاوہ نہایت قیمتی موتی لگے ہوئے تھے[۸]۔ اورنگ زیب کو شاہ ایران نے جو تحایف بھیجے تھے ان میں ایک بہت ہی قیمتی تھا۔ اس کی قیمت ساٹھ ہزار روپے تھی[۹]۔ عالمگیر نامہ کا مصنف اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس کا وزن ۳۰ ۔ ایسا موتی ابرنیساں کے صلب سے کم ہوا ہوگا اور اس رنگ اور شکل کا موتی شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو، اس لئے اس درِ یتیم کی جوہریوں نے ساٹھ ہزار لگائی، رومی و فرنگی تاجر قیمتی موتیوں کو فروخت کرنے کی غرض سے ہندوستان برابر لاتے رہے۔ انھیں یہاں ت ملتی تھی وہ شاید کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ سرطامس اور ٹیورنیر نے مغل بادشاہوں اور ان کے امیروں کے یہاں بہت سے فروخت کئے اور منھ مانگے دام وصول کئے۔

بعض موتی بہت بڑے ہوتے۔ سب سے بڑا موتی تخت طاؤس میں لگا ہوا تھا اور تخت کے طاؤس کی گردن میں لٹکتا رہتا تھا موتی عموماً سرپیچ، ہار اور تسبیح میں لگائے جاتے تھے۔ شاہ جہاں کی سرپیچ میں پانچ لعل کے علاوہ ۴۲ بڑے بڑے موتی تھے جن میں ایک کے برابر تھا۔ اس کے پاس ایک تسبیح تھی جس میں ۳۰ موتی اور پانچ لعل تھے۔ اس کی قیمت آٹھ لاکھ روپے تھی۔ بادشاہ نامہ کے نے شاہ جہاں کی دو تسبیحوں کا ذکر کیا ہے جن میں ۱۲۵ موتی تھے اور دو دو موتیوں کے بعد ایک یاقوت کا دانہ تھا۔ دونوں تسبیحوں کے بیچ وتی کا وزن ۳۲ رتی تھا جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی[۱۰]۔ جہانگیر نے راناکرن کو موتیوں کا ایک ہار دیا تھا جس کی قیمت پچاس ہزار روپے ۔ موتی کبھی تکمہ میں بھی لگایا جاتا تھا۔ جہانگیر نے اپنے اٹھارویں سال جلوس میں شہزادہ شہریار کو خلعت میں ایک قبائے نادری دی تو اس کا یک قیمتی موتی کا تھا۔ جب کسی کو شاہانہ خلعت دیا جاتا تو اس میں موتی ضرور ہوتا۔ موتی اس فیاضی سے انعام میں دئے جاتے تھے کہ شہزادوں ر باریوں کے علاوہ اور لوگ بھی اس انعام سے سرفراز ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر نے ایک گویئے تجر خاں کو دس ہزار روپے اور پچاس جوڑے

---

[۱] جہانگیری، ص ۲۴۰۔ [۲] اقبال نامہ جہانگیری، ص ۱۱۷۔ [۳] آئین اکبری جلد اول آئین ۳۔ [۴] تزک جہانگیری، ص ۱۵۷۔ [۵] ایضاً ص ۲۶۶۔
[۶] شاہ نامہ جلد اول، ص ۲۰۹۔ [۷] آئین اکبری جلد اول آئین ۳۔ [۸] تزک جہانگیری، ص ۳۵۴۔ [۹] منتخب اللباب جلد اول، ص ۲۰۵۔ [۱۰] عالمگیر نامہ
۲۲، و ماثر عالمگیری، ص ۳۶۔ [۱۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ۳۹۲۔ [۱۲] ایضاً۔

پڑے کے ساتھ موتی کا ایک ہار بھی دیا۔[1] وہ اپنے دسویں سال جلوس میں اجمیر گیا تو وہاں کی درگاہ کے خدام میں ساٹھ ہزار روپے اور ایک سو کو
کے علاوہ موتی، مرجان اور کہربا کی ستر تسبیحیں بھی تقسیم کیں۔[2] شاہجہاں کے دربار میں فارسی کا مشہور شاعر حاجی محمد جان قدسی پہلی مرتبہ حاضر ہوا
ایک قصیدہ پیش کیا تو صلہ میں شاہجہاں نے اس کے منہ کو سات بار جواہرات سے بھرا۔ اس طرح کہ جواہرات کی مختلف قسمیں طلب کیں اور حکم
کہ قدسی کا منہ سات دفعہ موتیوں اور دوسرے جواہرات سے پُر کیا جائے۔ سامنے سونے کا طشت رکھ دیا گیا۔ قدسی کا منہ جواہرات سے بھر جا
تو اس طشت میں ان کو گرا دیتا تھا۔[3] شاہجہاں نے ممتاز محل کی قبر کے لئے موتیوں کی ایک بہت ہی قیمتی چادر طیار کرائی تھی جو ہر جمعرات نیز یوم و
کو اس کی قبر پر ڈالی جاتی۔[4] اورنگ زیب نے سمبھاجی کے لڑکے ساہو جی کو خلعت دیا تو اس موقع پر اس کو جواہرات کی ایک تھیلی بھی دی جس
موتیوں کا ایک ہار بھی تھا۔[5]

عقیق، مرجان، لاجورد

اس زمانہ میں عقیق، مرجان، لاجورد کی بڑی بہتات رہی، لاجورد تحفے میں کئی کئی من آیا کرتے تھے۔ مث
بلخ سے نذر محمد خاں نے شاہجہاں کو تحایف بھیجے تو ان میں گھوڑوں، اونٹوں، تورانی کپڑوں، قالینو
نمدوں اور چینی برتنوں کے علاوہ ایک سو من سنگ لاجوردی تھا۔[6]
تاج محل میں قیمتی پتھروں کے علاوہ بکثرت جواہرات بھی لگائے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کے نام اور ان کی تعداد حسب ذیل ہے
ہیرے ۶۲۵ - موتی ۵۰ - نیلم ۴۷ - زمرد ۲۲۴ - یاقوت ۱۴۲ - لاجورد ۵۵۶ - پکھراج ۵۵۶ - عقیق ۵۴۰ - فیروزہ ۶۷۰ - مونگہ ۱۴۲ - ی
اور دوسرے قیمتی پتھروں میں سلیمانی، پتونیہ، موسیٰ، عجوبہ، سنگ، رخام، نخود، مقناطیس غوری، تانبڑہ، یمنی، پائے زہر، اسپنہ، خارا، بلو
چکھمنی، گوڈا، مرمر، سماق، کھٹو، یاقوت، بانسی، گلابی، جدولدار، یشب، ابری، دہان فرنگ، سنکھ وغیرہ تو بے شمار تھے۔ طرز تعمیر کے علاوہ
پتھروں اور جواہرات کی باہمی ترکیب اور مرصع کاری کی وجہ سے تاج محل دنیا کے عجائب روزگار میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ ممتاز محل کی
کے پاس سونے کا ایک کٹہرا بھی بنوایا گیا تھا، اس میں اتنے جواہرات جڑے گئے تھے کہ چھ لاکھ روپے خرچ ہو گئے تھے۔ یہ زریں کٹہرا ش
میں ہٹا دیا گیا کہ کہیں چوری نہ ہو جائے اور اس کے بجائے سنگ مرمر کا ایک مجحر لگا دیا گیا جو دس برس میں طیار ہوا اور اس میں بھی پچاس
روپے صرف ہوگئے۔[7]

تخت طاؤس

شاہجہاں کے پاس مختلف قسم کے جواہرات کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اُس نے سوچا کہ ان جواہرات کا استع
اس طرح کیا جائے کہ ایک طرف تو ان کی نمائش ہو، دوسری طرف اس کی سلطنت کی شان و شوکت کا مظاہرہ
ہو سکے۔ اس نے اپنے جواہرات کا انتخاب کرنا شروع کیا تو محل کے اندر دو کرور روپے کے جواہرات نکلے۔ شاہی خزانے کے جواہرات
قیمت تین کرور روپے لگائی گئی۔ اس نے شاہی خزانے سے ۸۶ لاکھ کے جواہرات منتخب کئے اور اپنے زرگر خانہ کے داروغہ بے بدل خا
ایک شاہی تخت بنانے کا حکم دیا۔ جب تخت بننے لگا تو اس میں خالص سونے کے ایک لاکھ تولے لگائے گئے۔ ان کی قیمت چودہ لاکھ
تھی۔ تخت کا طول سوا تین گز، عرض ڈھائی گز اور بلندی پانچ گز تھی۔ اُس کے اوپر ایک چھت دی گئی جس کے اندرونی حصہ میں
ترصیع اور میناکاری کی گئی۔ چھت کے بیرونی حصہ میں لعل و یاقوت جڑے گئے اور اس کو زمرد کے بارہ ستونوں پر قایم کیا گیا۔ چھت
دو مرصع طاؤس بھی تھے جن کی گردنوں میں بڑے بڑے قیمتی موتی لٹکائے گئے۔ دونوں طاؤسوں کے درمیان ہیرے، لعل، زمرد او
سے مرصع ایک درخت بنایا گیا۔ تخت پر چڑھنے کے لئے تین پائے کی ایک سیڑھی تیار کی گئی اور اسے جواہرات سے آراستہ کیا گیا۔ تخت
گرد تکیہ لگانے کے لئے گیارہ مرصع تختے تھے جن میں سے درمیان کا تختہ جس پر تکیہ لگا کے بادشاہ بیٹھتا تھا، دس لاکھ روپے کی قیمت

---

[1] ایضاً ص ۱۳۴ - [2] ایضاً ص ۱۴۷ - [3] بزم تیموریہ ص ۸۰-۱۷۹ - [4] منتخب اللباب جلد اول، ص ۴۰۵ - [5] مآثر عالمگیری
[6] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم، ص ۸۹ - [7] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۶-۳۲۵ -

اسی میں وہ لعل بھی تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے جہانگیر کو بطور تحفہ بھیجا تھا۔ بے بدل خاں نے اس تخت کو جس پر ایک کرور روپے کی لاگت آئی تھی سات سال میں طیار کیا۔ تخت کے طیار ہو جانے پر شاہ جہاں نے خوش ہو کر بے بدل خاں کو روپے میں تلوایا۔ جب شاہجہاں اپنے آٹھویں سال جلوس کے جشن میں اُس تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس کی شان میں قصیدے، نظمیں اور مثنویاں کہی گئیں۔ حاجی محمد جان قدسی نے اس کی تاریخ "اورنگ شاہنشاہی عادل" کہکر نکالی[1]۔ اورنگ زیب نے اس تخت کی ترصیع و آرائش میں اور اضافہ کیا۔ برنیر نے اس وقت اس کی قیمت تین کرور روپے لگائی تھی[2]۔ نادر شاہ اس کو لوٹ کر مال غنیمت میں اپنے ساتھ لے گیا۔

خافی خاں کا بیان ہے کہ شاہ جہاں نے اپنے خزانے میں ۲۴ کرور روپے، اور پندرہ سولہ کرور کے جواہرات، سونا، چاندی، اور قیمتی ظروف چھوڑے[3]۔ بادشاہوں کے علاوہ شہزادوں کے پاس جواہرات علحدہ ہوتے۔ داراشکوہ کے حرم کے پاس ستائیس لاکھ کے جواہرات اور موتی تھے۔ جہاں آرا بیگم نے ۱۰۷۰ھ میں اورنگ زیب کو ایک ہار دیا جس میں پانچ قطعہ لعل اور موتی تھے۔ اس کی قیمت دو لاکھ اسی ہزار روپے تھی[4]۔

جواہر خانہ اس زمانہ میں قیمتی جواہرات کے لئے ایک جواہر خانہ قایم تھا جس کا نگراں ایک ممتاز منصب دار ہوتا تھا۔ اس میں ہیرے، لعل، نیلم، زمرد، موتی اور دوسرے طلائی و نقرئی ساز و سامان کا انبار لگا رہتا تھا۔ گو عالمگیر کے عہد میں شاہجہاں کے زمانہ کی طرح جواہرات کی خریداری کا شوق نہیں رہ گیا تھا پھر بھی اس کا خزانہ جواہرات سے معمور تھا۔ اس کا لڑکا شہزادہ محمد اکبر جب ایران گیا تو وہاں کے بادشاہ نے ایک باغ میں اس کی ضیافت کا سامان کیا۔ خزاں کا موسم تھا، درختوں میں پھل نہ تھے۔ اس لئے شگوفوں اور پھلوں کے بجائے موتیوں سے تمام درختوں کو بار آور کیا گیا۔ شاہزادہ محمد اکبر نے موتیوں کی یہ کثرت دیکھی تو اس کی وطنی غیرت اُبھر آئی۔ شاہ ایران کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کہا کہ موتیوں کے دریا آپ کے قبضہ میں ہیں، اس لئے باغ کے تمام درختوں میں موتیوں کے شگوفے اور پھل لگے ہوئے ہیں اور حب الوطنی کے جوش میں بولا اس کے باوجود ہندوستان کے جواہر خانہ میں جواہرات کا اس قدر ذخیرہ جمع ہے کہ اگر ہم لوگ چاہیں تو مختلف قسم کے جواہرات سے باغ کی آئین بندی کر سکتے ہیں[5]۔

شاہی خزانے میں نذرانوں اور تحفوں کی وجہ سے بکثرت جواہرات جمع ہوتے رہتے تھے اور مغل بادشاہوں اور ان کے امراء کی دولت کی انتہا نہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ مورخوں کا بیان ہے کہ نادر شاہ ہندوستان سے جو مال غنیمت لے گیا اس میں تخت طاؤس کے علاوہ ۲۵ کرور کے جواہرات، ۲۵ کرور کی اشرفیاں اور چاندی کے سکے، ۵ کرور کا سونا چاندی، ۹ کرور کے قیمتی ظروف، ۲۰ کرور کا فرنیچر اور دو کرور قیمتی کپڑے وغیرہ تھے۔

سونا سونا اس زمانہ میں بہت سستا تھا اس لئے نہ صرف زیورات بلکہ ضرورت کی اکثر چیزیں سونے ہی کی بنائی جاتی تھیں۔ شاہی محل میں کھانے کے برتن، ساغر، مینا، صراحی، پاندان، خاصدان اور سنگاردان وغیرہ سونے ہی کے ہوتے تھے۔ بادشاہوں اور شہزادوں کو تلواروں اور خنجروں کے موٹھ میں سونا ضرور ہوتا تھا۔ دربار کے نقیب اور چاؤش کے عصا، بلم اور برچھے وغیرہ میں بھی چاندی سونا ضرور ہوتا۔ دیوان عام اور دیوان خاص میں شامیانے، پردے اور چھت گیر کے ستون بھی چاندی سونے کے ہوتے۔ زینت و آرائش کے لئے مختلف قسم کے مصنوعی پھل اور پرندے سونے ہی کے بنائے جاتے۔ جہانگیر نے ایک مرصع صراحی بنوائی تھی جو ریچھ کی شکل کی تھی۔ اُس کو اس نے شاہ عباس کے پاس ایران تحفہ کے طور پر بھیجا[6]۔ مکانوں کی زینت و آرائش میں طلائی کام کی بڑی فراوانی ہوتی۔ فتحپور سیکری میں جو محل بنوائے اُن میں سے ایک کا نام محل مریم الزمانی یا سنہرا مکان ہے۔ یہ جہانگیر کی ماں کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اس کے تمام ستونوں

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم، ص ۸۱ - ۸۰، ماثر الامرا جلد اول، ص ۲۳۲ - [2] سفر نامہ برنیر اردو ترجمہ ص ۴۰۰ - [3] منتخب اللباب جلد اول ص ۵۰۵۔
[4] عالمگیر نامہ ص ۵۰۸ - [5] منتخب اللباب جلد دوم، ص ۲۸۸ - [6] تزک جہانگیری، ص ۱۲۸۔

دروازوں اور دیواروں پر خوشنما نقش و نگار بنا کر طرح طرح کی طلائی اور نقرئی مسلوہ کاری کی گئی تھی۔ اس کی دیواروں پر سونے کی رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی تصویریں بھی بنائی گئی تھیں۔

اعتماد الدولہ نے سونے اور چاندی کا ایک تخت بنوایا تھا جس کی شکل شیر کی سی تھی۔ اس میں ساڑھے چار لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے اور تین سال کی مدت میں طیار ہوا تھا۔ یہ تخت جہانگیر کے چودھویں سال جلوس میں اعتماد الدولہ نے اُسے بطور نذرانہ پیش کیا تھا۔[1] شاہجہاں نے تخت طاؤس کے علاوہ سونے کا ایک تخت رواں بھی بنوایا تھا۔ عالمگیر نے اس پر چھپت کا اضافہ کرکے اُس کو بنگلہ نما کر دیا تھا۔[2] شاہجہاں کے پاس سونے چاندی کا ایک نقار خانہ تھا۔ بڑا نقار خانہ تو سونے کا تھا لیکن کورلہ، کرنا اور سرنا وغیرہ چاندی کے تھے۔[3] شاہجہاں اور عالمگیر دونوں کے ہاتھیوں کے ہودج سونے کے تھے۔ عالمگیر نے تو ایک بنگلہ نما طلائی ہودج بھی بنوایا تھا۔[4]

غیر معمولی مقدار میں سونا انعام میں دینا ایک غیر معمولی بات تھی۔ جہانگیری دور کے شاعر حیاتی گیلانی نے ایک مثنوی "سلیمان و بلقیس" لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تو اُس نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تلوا کر انعام دیا۔[5] ابو الفضل کا بیان ہے کہ سونا ہندوستان کے شمالی پہاڑوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ دریائے گنگا اور سندھ کے بالو سے بھی نکالا جاتا تھا۔ اکبری عہد میں ایک تولہ سونے کی قیمت ایک گول اشرفی تھی اور چاندی ایک روپیہ میں ایک تولہ دو سرخ خریدی جاتی تھی۔[6]

(نیا دور)

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۲۸۰ - [2] عالمگیر نامہ ص ۴۵۳ - [3] اقبال نامہ جہانگیری، ص ۸۰ - [4] منتخب اللباب جلد دوم، ص ۹۰ -
[5] بزم تیموریہ ص ۱۵۶ - [6] آئین اکبری جلد اول آئین ۱۲ -

بچی اپنی نازک آواز میں گا رہی ہے اور اب ہمدرد کے نونہال کا ایک چمچہ پینے کے بعد وہ دوبارہ کھیل میں لگ جائے گی۔ وہ ایک صحت مند اور طاقت ور بچی ہے۔

نونہال گرائپ سیرپ: دانت نکلنے کی تکلیف، قبض، اپھارا، ہچکی اور دستوں کو فوراً آرام پہنچاتا ہے۔

نونہال ... وٹامنوں سے بنا ہوا بہترین ٹانک ہے۔ ... بیماریوں سے بچاتا ہے۔

نونہال

... تندرست اور خوش و خرم رہتے ہیں

دہلی۔ کانپور۔ پٹنہ

ابوالعلاء معرّی پر ہندوستانی فلسفہ کے اثرات

(سید احتشام احمد ندوی ایم۔ اے)

معرّی کے جدید و قدیم تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے فلسفہ کا ایک اہم ماخذ ہندوستانی فلسفہ بھی ہے۔
ابن الانباری اپنی کتاب "نزہتہ الالبا"[1] میں لکھتے ہیں :۔

"[illegible] میں بغداد سے لوٹنے کے بعد وہ اپنے گھر سے باہر کہیں نہ جاتا تھا۔ اس نے ۸۶ برس کی عمر پائی جس میں ۴۵ سال گوشت نہیں چکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ برہمن تھا۔"

ابن جوزی اپنی کتاب "المنتظم"[2] میں رقمطراز ہیں کہ :۔

"معرّی کا ظاہری حال اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ برہمنوں کے مذہب کی جانب مائل تھا، اس لئے وہ بھی جانوروں کو ذبح کرنا پسند نہیں کرتے اور رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔"

ذہبی "تاریخ الاسلام"[3] میں معرّی کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :۔

"وہ جانوروں پر شفقت کے خیال سے ان کا گوشت نہیں کھاتا تھا، ترکاریوں کے علاوہ دوسری چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرتا تھا حتیٰ کہ اس کو برہمنوں کی جانب منسوب کیا جانے لگا۔ اس کے خیالات، اثبات صانع، انکار رسول اور تحریم حیوانات کے سلسلہ میں وہی ہیں جو برہمنوں کے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ سانپوں، بچھوؤں تک کو تکلیف پہونچانا پسند نہیں کرتا۔"

"روضۃ المناظر" میں ابن الشحنہ فرماتے ہیں[4] :۔

"معرّی نے ۴۵ برس ہندوؤں کے مذہب کے مطابق گوشت، انڈا اور دودھ اپنے اوپر حرام کر لیا۔"

اسی طرح عقد الجمان میں عینی[5] لکھتے ہیں کہ :۔

"برہمنوں کے فلسفہ کے مطابق ۴۵ سال اس نے انڈا، دودھ اور گوشت استعمال نہیں کیا۔"

تعجب ہے کہ اتنی واضح شہادتوں کے بعد بھی کسی نقاد نے معرّی کے اس پہلو کو الگ موضوع بحث قرار نہیں دیا اور جدید ناقدین نے اس موضوع پر لکھا ہے وہ بھی ضمنی طور پر لکھا ہے۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ معرّی کو ہندوستانی فلسفہ سے واقفیت کیسے ہوئی؟۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین[6] نے یہ رائے دی ہے کہ معرّی نے ہندوستانی فلسفہ کی تعلیم بغداد میں حاصل کی، کیونکہ بغداد جانے سے قبل اس کے یہاں ہندوستانی فلسفہ کا اثر نظر نہیں آتا۔ یہ خیال اس بنا پر بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بغداد میں اس وقت ہندوستانی فلسفہ کے کافی اثرات موجود تھے،

---

[1] آثار ابی العلاء باب "نزہتہ الالبا"۔ [2] آثار ابی العلاء باب "المنتظم"۔ [3] آثار ابی العلاء باب "تاریخ الاسلام" للذہبی۔ [4] آثار ابی العلاء [باب روضۃ] المناظر۔ [5] آثار ابی العلاء باب عقد الجمان۔ [6] تجدید ذکری ابی العلاء باب "المقالۃ الاولیٰ"

تناسخ وغیرہ جیسے مسایل زیر بحث رہتے تھے۔[1]

ہندوستانی فلسفہ مسلمانوں تک دو راہوں سے پہونچا ایک تو ان اقتصادی اور سیاسی تعلقات کی وجہ سے جو فتح سندھ کے بعد عربی اور اہل ہند میں استوار ہو گئے تھے، دوسرا ذریعہ وہ کتابیں جو سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ ہندوستان کے اثرات کا پتہ مسعودی اور جاحظ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی کا ذہین طبقہ ہندوستانی فلسفہ اور خیالات سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اور عربوں پر نظریہ تناسخ کے بھی کافی اثرات پڑے ہیں۔ احمد بن حائط اور ابو مسلم خراسانی اور محمد بن ذکریا رازی پر اس نظریہ کے اثرات موجود ہیں، شیعوں کا فرقہ قرامطہ بھی اس سے متاثر ہے۔

معری کی کتابوں خصوصاً لزومیات، سقط الزند اور رسالۃ الغفران کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلسفہ اس کے فلسفہ کا اصل ماخذ ہے۔ اگرچہ اس کے فلسفہ کے تین عجمی ماخذ بتائے جاتے ہیں، یونانی، فارسی اور ہندی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف ہندوستانی فلسفہ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ معری نے نہ صرف یہ کہ نظری طور پر اسکو قبول کیا اور اس کی تائید کی بلکہ عملی طور پر بھی یہ فلسفہ اس کی زندگی میں رچ بس گیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے بنیادی عناصر ہیں جن کو معری نے ہندوستانی فلسفہ سے اخذ کیا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل فلسفیانہ خیالات ہندوستانی فلسفہ کی غمازی کرتے ہیں۔

۱ - گوشت، انڈا اور دودھ کو حرام سمجھنا اور صرف ان چیزوں کو جایز سمجھنا جو زمین سے اُگتی ہیں۔
۲ - دُنیاوی علایق سے الگ تھلگ رہ کر رہبانیت اور عزلت نشینی کی زندگی بسر کرنا۔
۳ - تجرد کی زندگی کو ترجیح دینا۔
۴ - مُردے کے جلانے کو اچھا سمجھنا۔
۵ - مادہ، روح اور خدا تینوں کو قدیم سمجھنا۔
۶ - چمڑے کے جوتے کا استعمال ناجایز خیال کرنا اور لکڑی کے بنے ہوئے جوتے (کھڑاؤں) پسند کرنا اور رنگین کپڑوں کا استعمال نہ کرنا۔

مذکورہ خیالات محض نظری حد تک محدود نہ تھے بلکہ معری ان کا پابند بھی تھا۔ اس کے علاوہ دو مسئلے ایسے ہیں جن میں معری نے ہندوستانی فلسفہ کی مخالفت کی ہے۔ اُس نے تناسخ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے لیکن اس کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے اس تصور کا ذکر کرتا ہے کہ وہ ہاتھوں کے ناخن بڑھانے کو زاہدانہ زندگی کی علامت سمجھتے ہیں مگر وہ اس کو بھی قبول نہیں کرتا وہ تناسخ کی تردید میں کہتا ہے[2]

یقولون ان الجسم ینقل روحہ — الی غیرہ حتی یہذبہ النقل

لوگ کہتے ہیں کہ جسم سے روح دوسرے جسم میں منتقل کی جاتی ہے حتی کہ یہ انتقال جسم کو مہذب بنا دے۔

فلا تقبلن مایخبرونک ضلۃ — اذا لم یؤید ما اتوک بہ العقل

جس غلط بات کی وہ تم کو خبر دے رہے ہیں اس کو مت قبول کرو، جبکہ ان کی بات کی عقل تائید نہ کرتی ہو۔

اسی طرح ناخن کے بارے میں کہتا ہے:-

نقلم للنسک اظفرنا، — وطولت الہند اظفرہا

---

[1] تجدید ذکری ابی العلاء پہلا مقالہ - [2] تجدید ذکری ابی العلاء صفحہ ۲۰۶

ناہرانہ زندگی کے لئے ہم اپنے ناخن تراشتے ہیں اور اہل ہند اپنے ناخن بڑھاتے ہیں۔

جانوروں کی حرمت کا تصور معری نے ہندوستانی فلسفہ سے اخذ کیا ہے۔

فلا تاکلن ما اخرج البحر ظالماً، ولا تبغ قوتاً من غریض الذبائح

ظالم بن کر جو کچھ سمندر نکالتا ہے اس کو مت کھاؤ، تازہ ذبح کئے ہوئے جانوروں سے غذا مت تلاش کرو۔

ولا تفجعن الطیر وہن غوافل بما وضعت فالظلم شر القبائح

اور چڑیوں کو پریشان مت کرو اس حال میں کہ وہ اس سے غافل ہیں جو کہ انھوں نے رکھا ہے (یعنی انڈے دئے ہیں) اس لئے کہ ظلم بد ترین شر ہے۔

جب معری کے اس عقیدہ کی خبر عام ہوگئی تو مصر کے امامیہ مذہب کے بعض اہم لوگوں (ابو نصر، ہبۃ اللہ بن عمران) نے معری سے جانوروں کی تحریم کے مسئلہ پر مناظرہ کیا۔ معری نے کبھی یہ کہا کہ میں غربت کی وجہ سے گوشت نہیں کھاتا، کبھی یہ کہا کہ نہ کھانا، بہرحال مباح تو ہے ہی۔ اس بحث کے چند دنوں بعد معری کا انتقال ہوگیا[1]۔

معری ہر ذی نفس کو یکساں قابل احترام سمجھتا تھا وہ بادشاہ اور مچھر کی جان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا[2]، وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر جاندار کی جان یکساں عزیز ہے۔ وہ ایک مچھر کا مرثیہ کرتے ہوئے کہتا ہے[3]:-

کلاہما یتوقی والحیاۃ لہ، عزیزۃ ویروم العیش محتاجا

ہر ایک ان دونوں میں سے مصائب سے بچتا ہے زندگی کو عزیز رکھتا ہے اور زندگی کا حاجتمند نظر آتا ہے۔

ذکی المحاسن اپنی کتاب ابو العلاء ناقد المجتمع میں لکھتے ہیں کہ معری اپنے خیالات کے اعتبار سے عربی ادب میں منفرد سمجھا جاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جانور نہ کھانے اور تقشف و زہد کے خیالات اس کے اپنے ہیں، حالانکہ یہ فارسی، یونانی اور ہندوستانی فلسفہ سے ماخوذ ہیں[4]۔

طبیب کسی شخص کو بٹیر کھانے کا مشورہ دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس غریب جانور کو اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ وہ کمزور ہے یہی قصہ اس طرح بھی روایت کیا جاتا ہے کہ طبیب نے معری کے لئے تیتر تجویز کیا جب وہ اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا:- افسوس کہ تجھ کو کمزور سمجھ کر یہ پکڑ لائے ہیں یہ لوگ یہ ہمت نہ کر سکے کہ شیر کے بچہ کو پکڑ لاتے[5]۔

معری سے ایک شخص سے ملاقات ہوئی تو اس نے سوال کیا: "آپ گوشت کیوں نہیں کھاتے" معری نے کہا: "میں جانوروں پر شفقت کرتا ہوں"۔ اس نے کہا کہ:- "آپ کا ان درندوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کی غذا ہی خالق کائنات نے زندہ جانور بنائی ہے۔ کیا آپ اس سے زیادہ صاحب عقل و تدبیر ہیں؟" اس پر معری خاموش رہے[6]۔

جانوروں کی شفقت کا تصور اس نے ہندوستان کے جین مذہب سے لیا تھا اس ہندوستانی فلسفہ کو اس نے غیر معمولی اہمیت دی اور ہر قسم کے جانوروں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا حتیٰ کہ وہ چمڑے کا جوتا اس بنا پر ناپسند کرتا تھا کہ وہ جانوروں کی کھال سے بنتا ہے۔ کھڑاؤں کو ترجیح دیتا ہے اور کہتا ہے:-

فاجعل حذائی خشباً انني، ارید البقاء علی الدارش

میرا جوتا لکڑی کو بناؤ میں ہرن کی سیاہ جلد کو پسند کرتا ہوں[7]

[1] تمہید ذکری ابی العلاء صفحہ ۲۰۶ - [2] مقدمہ رسالۃ الغفران مرتبہ کامل گیلانی - [3] تاریخ الادب العربی احمد حسن زیات اور مقدمہ رسالۃ الغفران [4] ابو العلاء ناقد المجتمع، ذکی المحاسن، صفحہ ۲۰، دار الفکر العربی - [5] مقدمہ الغفران مرتبہ کامل کیلانی، نزہۃ الالباء، ابن انباری ص ۴۲۵ [6] المنتظم ابن جوزی - [7] فلسفۃ ابی العلاء، عبد القادر - ص ۸۱

ابوالعلاء معری، جینیوں کی تقلید میں رنگین کپڑے پہننا ناجائز سمجھتا تھا اور ہمیشہ سفید کپڑے استعمال کرتا تھا۔ کہتا ہے[1]:-

لباسی البرس فلا اخضر ولا خلوقیٌّ ولا أدکن

میرا لباس سفید ہے، نہ سبز ہے نہ سرخ اور نہ خاکی۔

تقشف، زہد اور دنیاوی لذات سے کنارہ کشی بھی ہندوستانی فلسفہ کے اثرات ہیں، قدیم ہندوستان میں رہبانیت ایک معروف حقیقت ہے[2]۔ وہ لوگ دنیاوی لذات سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے، کسی غار میں جاکر ریاضتیں کرتے تھے جسم کو تکلیف دینے کے لئے ناک، کان اور منہ وغیرہ کو بند کرتے تھے تاکہ مادیت کم ہو اور روحانیت پیدا ہو اور وصال حق نصیب ہوسکے[3]۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ معری کی یہ تمام رائیں ہندوستانی فلسفہ کا نتیجہ ہیں[4]۔

بدھ مذہب، انسان کے وجود کو ایک شر قرار دیتا ہے اسکے نزدیک روحانیت میں ضم ہوجانا ہی ذریعۂ نجات ہے اور یہ فنائی کیفیت ضبطِ نفس ہی سے حاصل ہوسکتی ہے[5]، وہ ہندوستان کے ریاضت کے اس نظریہ کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے:-

یقرب جسمہ للنار عمداً وذالک منہ دین واجتہاد

(ہندوستانی) عمداً اپنے جسم کو آگ سے قریب تر کر دیتا ہے، اس کے نزدیک یہ دین اور جد وجہد ہے۔

معری کی ذاتی زندگی بھی ایسی ہی تھی، وہ زمین پر لیٹتا، موٹے جھوٹے کپڑے پہنتا، بہت معمولی غذا استعمال کرتا[6]۔ سال میں ۳۰ دینار کل اس کی آمدنی تھی، نصف خود لے لیتا تھا اور نصف اپنے خادم کو دیتا تھا۔ مسور کی دال کھاتا، جاڑوں میں ایک گدا اور گرمیوں میں بردی کے درخت کی چٹائی۔ یہ تھی معری کی کل کائنات۔

جب اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ یونان کے بعض فلسفی بھی ہندوستان آئے ان میں قلانوس، فیثاغورس کا شاگرد بھی تھا اس نے ہندوستان سے لوٹ کر تقشف اور جسمانی لذتوں سے کنارہ کشی کی تعلیم عام کردی اور یہ خیال عام کردیا کہ عورتوں اور نسل میں کوئی بھلائی نہیں ہے[7] اور معری جیسا روشن دماغ فلسفی بھی اس سے متاثر ہوا۔

مُردے کو جلانا اس کی نظر میں بہت مستحسن کام ہے[8] اس نے نہ صرف ہندوستان کے اس نظریہ کی تائید کی ہے بلکہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مُردہ اس طرح منکر و نکیر کے سوال و جواب سے بچ جاتا ہے۔

حرق الھند من یموت فما زاروہ فی روحۃ ولا تبکیر

جو مرجاتا ہے اس کو اہل ہند جلا ڈالتے ہیں پھر نہ صبح کو اس کی زیارت کرتے ہیں نہ شام کو۔

واستراحو من ضغطۃ القبر میتاً وسوال المنکر و النکیر

مگر وہ قبر کے دباؤ سے نجات پا جاتے ہیں اور منکر و نکیر کے سوالات سے بھی۔

فاعجب لتحریق اہل الھند میتھم وذاک اروح من طول التباریح

اہل ہند کا اپنے مُردوں کو جلانا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ پڑے رہنے سے آرام دہ ہے۔

ان حرقوہ فما یخشون من ضبع سری الیہ ولا اخفی ولا تطریح

اگر وہ مُردے کو جلا دیتے ہیں تو نہ بجو سے ڈرتے ہیں نہ چھپانے اور پھینکنے سے۔

---

[1] فلسفہ أبی العلاء، عبدالقادر، صفحہ ۱۸ - [2] تجدید ذکری ابی العلاء طٰہٰ حسین۔ صفحہ ۳۰۸ - [3] تجدید، صفحہ ۸۳ - [4] حیاۃ الانسانیۃ عند أبی العلاء، صفحہ ۸۳ - [5] فلسفۃ أبی العلاء صفحہ ۱۸ - [6] تاریخ الادب العربی، احمد حسن زیات - [7] ابوالعلاء ناقد المجتمع زکی المحاسن صفحہ ۲۰ - [8] تجدید ذکری ابی العلاء طٰہٰ حسین، صفحہ ۳۰۵ -

تھا اور ہندوستانی فلسفہ کا جزر رہا ہے۔ معرّی ان تصورات سے بہت متاثر تھا اس نے مادہ، عناصر، زمان و مکان اور خدا سب ہی کو قدامت یا خلود سے متصف کیا ہے۔ اور ان کو لامتناہی قرار دیا ہے[1]۔ اس کی یہ رائیں ان اشعار میں ملاحظہ ہوں :-

ولو طار جبریل بقیۃ عمرہ، من الدہر ما استطاع من الدہر

اگر جبریل اپنی بقیہ عمر چھوڑ کر زمانہ سے بھاگنا چاہیں تو وہ اس پر قادر نہیں ہو سکیں گے کیونکہ زمانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

خالق لا یشک فیہ قدیم وزمان علی الانام تقادم

ایک خالق ہے قدیم، اس میں کوئی شبہ نہیں اور زمانہ ہے جو مخلوق کے خلاف آگے بڑھ رہا ہے۔

نزول کما زال ایامنا ویبقی الزمان علی ماتری

ہم ختم ہو جائیں گے جیسے کہ ہماری عمر ختم ہو رہی ہے اور زمانہ باقی رہے گا۔

نہار یمیر ولیل لکیر ونجم یغور ونجم یری

دن گزر رہے ہیں راتیں پلٹ رہی ہیں ستارے ڈوب رہے ہیں اور ابھر رہے ہیں۔

وعلی حالھا تدوم اللیالی فنحوس لمعشر او سعود

راتیں اپنے حال پر ہیں (یہاں) کس کے لئے نحوست ہے اور کسی کے لئے سعادت۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ تمام نظریات جن پر معرّی کی شہرت اور عظمت قائم ہے اور جو عربی دنیا میں اس کو ممتاز بناتے ہیں وہ کم و بیش تمام کے تمام ہندوستانی فلسفہ سے ماخوذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدماء اس کے فلسفیانہ مسلک کو برہمن مسلک تصور کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان سے اس کو ایک خاص شغف تھا، ابو عمر کے خط میں ان کو اس طرح مخاطب کرتا ہے "سلام کالعطرۃ الھندیۃ والروضۃ النجدیۃ"۔ تم پر ایسا سلام ہو جیسے ہندوستانی عطر ہوتا ہے یا نجد کا چمنستان[2]۔

معرّی ان سب خیالات کے باوجود کہاں تک دیندار تھا؟۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر گزشتہ زمانہ میں اہل علم نے بہت کچھ رائے زنی کی ہے جہاں بہتوں نے اس پر زندیقیت اور دہریت کا الزام لگایا ہے وہاں خاص لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو اس کو صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں اور اس کے خیالات کی تاویل کرتے ہیں۔ بہر حال اس اختلافی مسئلہ سے قطع نظر ہم اس کے یہاں ہندوستانی خیالات اور فلسفہ کے اثرات پاتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ معرّی بہت سی باتوں میں ہندوستانی نظریات پر تنقید کرتا اور انھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مثلاً مسئلۂ تناسخ ہے، معرّی اس کا بالکل قایل نہ تھا اور اس کو حقیقت پر مبنی تصور نہیں کرتا[3]۔

واقعہ یہ ہے کہ معرّی عقل پرست تھا اور ہر چیز جو اس کی عقل پر پوری اترتی تھی اس کو اختیار کر لیتا تھا۔ ہندوستانی فلسفہ کے مطالعہ کے بعد اس نے بعض چیزوں کو اچھا سمجھا اور تعریف کی اور بعض امور کی برائی کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معرّی کسی فلسفہ کا مقلد نہ تھا بلکہ اس کو فکر و نظر کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔

---

[1] تجدید ذکری أبی العلاء صفحہ ۲۶۰، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۸۔

[2] آثار أبی العلاء صفحہ ۹۵۔

[3] ملاحظہ ہو تجدید ذکری أبی العلاء، ڈاکٹر طہٰ حسین۔ "باب التناسخ"

اقبال کی گھریلو زندگی

(ان کے دیرینہ خادم سے انٹرویو)

(محمد الیاس مسعود)

آج سے پچیس چھبیس سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے مکان کے سامنے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی روزانہ سویرے گزرا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک بچی ہوتی تھی، یہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس بچی کی کتابیں اٹھائے خاموشی سے چلا جاتا اور تھوڑے دیر بعد ہاتھ میں کچھ سبزی وغیرہ لئے واپس آجاتا۔ اس آدمی کا اس طرح روزانہ آنا اور جانا معمول بن چکا تھا۔ بارش ہو یا آندھی، سردی ہو یا گرمی، اس شخص کے معمول میں کبھی فرق نہ آتا۔ ہم ہر روز اس شخص کو دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ علامہ اقبال وفات پا گئے انہی دنوں اخبارات میں علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ ساتھ مضامین میں ایک ایسے شخص کی تصویر بھی شایع ہوئی جسے ہم روزانہ دیکھتے تھے اور کبھی بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔

"ارے! یہ تو وہی ہے جو روز ہمارے گھر کے سامنے سے ایک بچی کو ساتھ لے کر گزرتا ہے۔" یہ تھا علی بخش۔ علامہ اقبال مرحوم کا وفادار خادم اور اس کے ساتھ علامہ مرحوم کی صاحبزادی بانو تھیں جنھیں وہ اسکول چھوڑنے روزانہ صبح سویرے جایا کرتا تھا۔

اس دن سے ادھیڑ عمر کے علی بخش کے ساتھ کچھ اس طرح سے عقیدت ہو گئی کہ یہ بابا ہمارے اس قومی شاعر کا خادم ہے، جس کی لکھی ہوئی نظمیں "پرندے کی فریاد" اور "قومی ترانہ" ہمیں زبانی یاد کروائی گئی تھیں۔ دن گزرتے گئے۔ اس شخص کا مضبوط جسم کمزور ہوتا گیا اور اس کی چال دھیمی ہوتی گئی۔ اس کے ساتھ ہر روز صبح جانے والی بچی اب جوان ہو چکی تھی اور اس نے باقاعدہ پردہ شروع کر دیا تھا۔

ابھی تک مجھے اس شخص سے گفتگو کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ حالانکہ دل میں مدت سے یہ آرزو تھی کہ اس بابا سے ضرور بات چیت کی جائے مگر کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز عید میلاد کے موقع پر انتظام کے سلسلہ میں یہ شخص ایک اور آدمی کے ساتھ ہمارے گھر آگیا۔ والد صاحب سے یہ دونوں صاحبان ملے اور کچھ باتیں کیں۔ ہم نے بھی جھک کر سلام کیا۔ اس شخص نے نہایت پیار سے سلام کا جواب دیا اور شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کئی دعائیں دیں۔ اس طرح پہلی مرتبہ ملنے کے بعد پھر کبھی کبھی سر راہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مگر جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس شخص کے پاس بیٹھ کر علامہ اقبال کے متعلق کچھ پوچھا جائے۔ آخر ایک دن ایسا ہی آگیا جب دیرینہ خواہش پوری ہونے کا سامان پیدا ہو گیا وہ اس طرح کہ علی بخش نے اپنی نجی خط و کتابت کی خدمت راقم کے سپرد کر دی اور اب ان کا آنا جانا ضرورت کے تحت ہونے لگا جب کبھی خط لکھوانا ہوتا تو وہ آجاتا۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے اب تک جاری ہے۔

ایک دن علی بخش اپنے گاؤں سے واپس آیا تو گاؤں سے ایک تحفہ بھی ساتھ لایا۔ یہ چند لڈو تھے جو اسے کسی سگائی کے سلسلہ میں ملے تھے۔ اس نے ان لڈوؤں کو خود کھانے کے بجائے از راہ شفقت میرے میز پر لا کر رکھدیا اور کہا "آپ کے لئے لایا ہوں۔" آنکھیں اٹھا کر جو دیکھا تو علی بخش مسکراتا ہوا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھائے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ آج اسے فرصت ہے

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ادھر میرے ذہن میں سوالات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔

مجھے علامہ اقبال مرحوم کی غذا کے متعلق دریافت کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ بچپن میں تو عجیب و غریب حالات ذہن میں آتے تھے ایک خیال یہ بھی تھا کہ نظمیں لکھنے کے لئے شاید خاص قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے جس سے انسان میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے جس طرح کشتی لڑنے کے لئے اکھاڑے میں ورزش لازمی ہوا کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"اچھا تو علی بخش صاحب مہربانی کر کے یہ بتائیے کہ علامہ مرحوم کی غذا کیا تھی، وہ کیا چیز شوق سے کھاتے تھے اور ان کے کھانے کے اوقات کیا تھے؟" اس نے پوچھا۔

"کھانے میں علامہ مرحوم کو قیمہ مٹر یا قیمہ آلو بڑا پسند تھا۔ میں عموماً ½ پاؤ قیمہ لایا کرتا تھا۔ ٹنڈے، گوشت اور سری پائے سے رغبت نہ تھی، آٹھویں، دسویں دن پلاؤ ضرور پکواتے تھے۔ کوٹھی کے تمام خادموں کو اکٹھا کرتے اپنے کمرہ کے سامنے برآمدہ میں بٹھا دیتے اور انھیں پلاؤ کھلاتے تھے۔ خود بھی سب کے ساتھ فرش پر بیٹھ جاتے خود نہ کھاتے تھے۔ کھاتے تھے۔ کھانا ایک وقت کھاتے تھے پکواتے دونوں وقت تھے۔ عموماً دو چپاتیاں اور تھوڑا سا سالن لیتے تھے۔ کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت نہ تھی، یوں بھی میٹھی چیزوں سے خاص لگاؤ نہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں دوست احباب بیسیوں قسم کے بہترین آم بھیجتے تھے۔ مگر ساری گرمیوں کے موسم میں دو تین دفعہ سے زیادہ آم نہ چوستے اور خربوزے بھی دو چار بار سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔"

علی بخش صاحب یہ تو بتائیے کہ علامہ چائے کتنی پیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر سے تعلق رکھنے کے باعث علامہ چائے تو بہت پیتے ہوں گے؟"

"آپ کو حیرت ہوگی کہ علامہ مرحوم تندرستی میں چائے بالکل نہیں پیتے تھے۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں صحت خراب ہو گئی تو حکیم صاحب کے کہنے پر چائے پی لیتے تھے۔ دودھ کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔

علی بخش صاحب یہ تو بتائیے کہ علامہ مرحوم کا پردہ کے متعلق کیا خیال تھا کیا ان کے ہاں اس کی پابندی تھی؟

پردہ

"جی ہاں، علامہ مرحوم پردہ کے بے حد پابند تھے۔ ان کے گھر کی خواتین سخت پردہ کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو جب کبھی بازار سے کوئی چیز منگوانی ہوتی تو مجھے طلب کرتی تھیں۔ گفتگو ملازمہ کے توسط سے ہوتی تھی کسی خادم نے کبھی خواتین سے براہ راست بات چیت کی تھی اور نہ ہی خواتین بے پردہ ہو کر خادموں کے سامنے آتی تھیں، حتیٰ کہ آواز تک کمرے سے باہر نہ نکلتی تھی۔"

علامہ مرحوم کے لباس کے متعلق بھی کچھ بتا دیجئے کہ وہ کس قسم کا لباس عموماً پسند کرتے تھے؟

"علامہ اقبال مرحوم کا لباس عموماً شلوار، قمیص ہوتا تھا۔ کھدر کی بازوؤں والی کرتی قمیص کے نیچے پہنتے تھے۔ ایک دفعہ بیگم صاحب نے ان کے لئے ریشمی رضائی طیار کی۔ جب انھیں اوڑھنے کے لئے دی گئی تو لینے سے انکار کر دیا۔ بیگم صاحب نے فرمایا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے آدمی آتے ہیں، اس لئے آپ کا بستر اچھا ہونا چاہئے، جواب میں فرمانے لگے۔ "ظاہری نمائش سے مجھے اپنی سہولت اور آرام زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے مجھے کھدر کے استر والی پرانی رضائی دے دی جائے، کھدر گرم زیادہ ہوتا ہے اور مجھے وہی درکار ہے۔"

علی بخش صاحب میں بچپن ہی سے آپ کو جاوید منزل میں دیکھ رہا ہوں، کیا آپ کے بیوی بچے بھی ہیں، اگر ہیں تو کہاں رہتے ہیں۔

"میری کوئی بیوی نہیں اور نہ ہی کوئی بچہ ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب علامہ مرحوم انارکلی میں رہائش پذیر تھے کہ والدین میری شادی کرنا چاہتے تھے، گھر سے والدین کا خط آیا کہ تمہاری شادی ہے تم آجاؤ، میں نے وہ خط علامہ مرحوم کو دکھایا۔ اور ساتھ رخصت کے لئے عرض کیا۔ کہنے لگے تم مت جاؤ۔ تمہیں کپڑے بنا دوں گا، مٹھائی لے دوں گا۔ اور اگر تم باز نہیں آؤ گے تو پھر پولیس کے حوالے کر دوں گا (یہ الفاظ ڈرانے کے لئے کہے) آخر مجھے دو تین دن کی رخصت دی گئی۔ ابھی اپنے گاؤں انل گڑھ ضلع ہوشیار پور پہونچا تھا کہ دوسرے دن منشی طاہر الدین صاحب کا خط مل گیا کہ علامہ صاحب فوراً بلاتے ہیں۔ میں اُلٹے پاؤں واپس پہونچ گیا۔ اور بس۔

اچھا تو علی بخش صاحب، سر عبدالقادر مرحوم اور چودھری محمد حسین مرحوم کے ساتھ علامہ مرحوم کے کیسے تعلقات تھے۔

یہ حضرات، علامہ مرحوم کے ساتھ کیسا انداز گفتگو اختیار کرتے تھے اور ان کی دوستی کیسی تھی! سر عبدالقادر سے علامہ مرحوم کی دوستی بڑی گہری تھی، علامہ مرحوم جن دنوں بھاٹی دروازہ میلا رام کی گلی میں رہتے تھے تو سر عبدالقادر مرحوم روزانہ شام کو سردیوں میں دھسا لپیٹے پھولہ میں گنڈیریاں ڈالے چوستے ہوئے قصوری جوتے پہنے، علامہ مرحوم کے پاس آتے تھے۔ علامہ مرحوم انھیں شعر سنایا کرتے تھے اکثر بحث بھی ہوتی تھی اور سر عبدالقادر مرحوم کے کہنے پر بعض دفعہ علامہ مرحوم اپنے اشعار کے الفاظ میں ترمیم کرلیا کرتے تھے، سر عبدالقادر مرحوم ان دنوں OBSERVER اخبار نکالتے تھے۔ اخبار کا دفتر مزار شاہ محمد غوث کے قریب واقع تھا۔

اسی طرح جن دنوں چودھری محمد حسین مرحوم اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے تو علامہ مرحوم کالج کی کونسل کے ممبر تھے۔ ایک دن علامہ مرحوم نے نواب ذوالفقار علی سے کہا کہ کوئی لڑکا بچوں کو پڑھانے کے لئے بھیج دیا کریں۔ چنانچہ نواب صاحب نے چودھری محمد حسین کا انتخاب کرکے انھیں بھیجا۔ جب چودھری صاحب مرحوم گریجویٹ ہوگئے تو علامہ مرحوم کی کوششوں ہی سے انھیں ملازمت ملی اور وہ پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ اس رفاقت اور محبت کی وجہ ہی سے چودھری صاحب مرحوم زندگی کے آخری دم تک علامہ مرحوم کے بچوں کے سرپرست رہے، وہ نہ صرف ان کے اتالیق تھے بلکہ ایک شفیق و مہربان نرم مزاج نگراں بھی تھے جس وفاداری اور خلوص سے چودھری صاحب مرحوم نے علامہ صاحب کی وفات کے بعد جاوید منزل میں بسنے والوں کی خدمت کی ہے اس کی مثال خال خال ملتی ہے۔

علی بخش صاحب معاف کیجئے، گفتگو کچھ طول پکڑ گئی ہے۔ اب صرف دو سوال اور پوچھوں گا، کیا بہتر نہ ہوگا کہ آپ خود ہی کچھ اور بتادیں جو اس وقت آپ کو یاد آرہا ہو۔

میرے آقا غریب پرور بہت تھے، اگرچہ بہت امیر نہ تھے کہ غریبوں کی عام مدد کرسکتے، مگر جو بھی تنگ دست آتا تو اس کی مدد ضرور کرتے، خواہ انھیں منشی طاہر الدین صاحب سے کچھ ادھار لے کر حاجتمند کی ضرورت پوری کرنا پڑتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب قرض لینے والا اپنا قرضہ واپس کرنے کے لئے آتا تو لینے سے انکار کردیتے تھے۔

علی بخش صاحب کیا علامہ مرحوم آپ پر کبھی ناراض بھی ہوتے تھے؟

ہاں، کیوں نہیں، جب ناراض ہوتے تو "بڑا بے وقوف ہے بڑا نالایق ہے" کہتے تھے۔ یہ انتہائی غصہ کے وقت کہتے تھے، ورنہ کچھ نہیں کہتے تھے۔

ہاں، علی بخش صاحب، یہ تو بتائیے کہ آپ کو کبھی کسی سرکاری افسر نے بھی علامہ مرحوم کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کبھی بلایا؟ یا نہیں۔ آیا کبھی کسی تقریب پر آپ کو دعوت دی گئی ہے جو علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں منعقد ہو رہی ہو ----؟

جہاں تک سرکاری افسروں کا تعلق ہے۔ مجھے خواجہ ناظم الدین صاحب نے بحیثیت گورنر جنرل کے لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں بلایا تھا، اس کے بعد سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے بھی مجھے اپنے ہاں بلا کر مجھ سے باتیں پوچھی تھیں۔ پھر مشتاق احمد گورمانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں تک جلسوں میں شرکت کا سوال ہے مجھے اکثر دعوت نامے ملتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اخبار والے مجھے ڈھونڈ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور مختلف سوالات کرنے لگتے ہیں، میری تصویریں بھی اتارے جاتے ہیں، مگر آج تک کسی نے نہ مجھے میری تصویر کی کاپی دی ہے اور نہ ہی اس اخبار کا پرچہ بھیجا ہے جس میں میری تصویر شایع ہوئی ہو یا میرے متعلق مضمون شایع ہوا ہو۔"

(منقول)

حافظ شیراز

(خانم ممتاز مرزا)

"گلبانگ" طہران کا ایک نوزائیدہ مجلہ ہے، اور اپنی حسن طباعت، نفاست نقوش و تصاویر اور مقالات زیبا کے لحاظ سے بڑی جاذب نظر چیز ہے۔ اس کے شمارہ اول و دوم میں ایک مقالہ اکبر آزاد طہرانی کا عنوان بالا سے شایع ہوا ہے جس کی تلخیص خانم ممتاز مرزا نے نگار کو مرحمت فرمائی ہے۔

محترمہ ممتاز مرزا ایک دہلوی خاتون ہیں اور خاندان حالی سے تعلق رکھتی ہیں۔ فارسی، اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق ہے اور سخن گوئی و سخن سرائی میں بہ لحاظ لطافت و حلاوت ایک خاص درجۂ امتیاز کی حامل ہیں۔

(نیاز)

پچھلے ہزار سال میں فارسی زبان کے ہزاروں شاعر پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے چند شعراء ضرور ایسے ہیں جن کے کچھ اشعار لوگوں کو یاد رہ گئے یا جن کا کلام کہیں کہیں لائبریریوں میں محفوظ ہے مگر قابل توجہ انھیں کبھی نہیں سمجھا جاتا، لیکن انھیں شعراء میں چند ایسے بھی ہیں جن کو دنیا فراموش نہ کرسکی، اور جن کا کلام اب تک مقبول ہے۔ ان میں منجملہ فردوسی، سعدی، مولوی و نظامی کے حافظ بھی ہیں اور اس وقت موضوع گفتگو انھیں کی شاعری ہے۔

حافظ کی زندگی افسوس ہے کہ حافظ کے تفصیلی احوال زندگی کا علم ہمیں حاصل نہیں، اور تذکرہ نویسوں نے جو کچھ ان کی بابت لکھا ہے وہ بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حافظ کی غزلیں خود ان کے زمانہ میں جمع نہ ہو سکی تھیں۔ ایک شخص محمد گل اندام جس نے دیوان حافظ کا مقدمہ لکھا اس امر کا مدعی ہے کہ وہ حافظ سے خاص رابطہ رکھتا تھا۔ لیکن اول تو یہی نہیں معلوم کہ یہ گل اندام کون تھا اور کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ وہ حافظ کا ہم عصر نہ تھا بلکہ فلسفۂ حافظ سے بھی قطعاً ناآشنا تھا۔

تاہم یہ بالکل یقینی ہے کہ حافظ نے واقعی قرآن حفظ کیا تھا، وہ علم تفسیر سے بھی آشنا تھا۔ اور مطالعہ کی مدد سے فلسفہ، منطق عقلی و نقلی، تاریخ مذاہب یہاں تک کہ موسیقی میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کرلی تھی، لیکن وسایل معاش کی طرف سے البتہ مطمئن نہ تھا اور صرف حافظ قرآن ہونے کی بنا پر جو وظایف شاہان وقت یا امراء سے ملتے تھے۔ انھیں پر اس کی زندگی کا انحصار تھا جو اس کے لئے ہمیشہ دردِ سر ثابت ہوا۔

۷۹۱ھ میں حافظ کا انتقال ہوا جبکہ اس کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ اس حساب سے سن پیدائش ۷۲۶ھ یا ۷۲۱ھ قرار

پاتا ہے ۔ اس کے والد بھی معمولی حیثیت کے شرفاء میں سے تھے، ان کا نام بہاؤالدین تھا جو اصفہان سے ہجرت کرکے شیراز چلے گئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا جبکہ حافظ بہت کمسن تھے ۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حافظ نے اپنا لڑکپن کس حال میں گزارا لیکن یہ یقینی ہے کہ جب وہ جوان ہوئے تو زمانہ شیخ ابو اسحاق کی حکومت کا تھا ۔ یہ بڑا نیک سیرت، خوش خلق، آزاد طبع بادشاہ تھا اور اہل شیراز اسے بہت دوست رکھتے تھے ۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا ۔ حافظ اس کے دربار سے متوسل ہوگئے ۔ لیکن یہ توسل زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا، کیونکہ ۷۵۸ھ میں یہ بادشاہ قتل کردیا گیا ۔

ابو اسحاق کے بعد امیر مبارزالدین جو یزد و کرمان کا بادشاہ تھا، شیراز پر بھی قابض ہوگیا ۔ یہ بڑا زاہد خشک تھا اور متقشف اہل مذاہب کے سوا اس کے یہاں کسی کا گزر نہ تھا ۔ شراب نوشی کی اس نے سخت ممانعت کردی اور ہر جگہ مذہبی و تلقین کا چرچا شروع ہوگیا تھا :-

در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند
کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشایند

یہ زمانہ حافظ پر بہت سخت گزرا، لیکن چونکہ نہ صرف اہل شیراز بلکہ خود شجاع، مبارزالدین کا فرزند اس کا مخالف تھا، اس لئے رمضان ۷۵۹ھ میں اسے اندھا کرکے شیراز سے نکال دیا گیا اور شاہ شجاع کی حکومت شروع ہوگئی ۔ حافظ کا یہ مصرع :-

کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

ظاہر کرتا ہے کہ حافظ کو اس انقلاب سے کتنی خوشی ہوئی ہوگی ۔

شاہ شجاع نے ۲۶ سال حکومت کی، لیکن یہ حکومت امن و سکون کی نہ تھی، سارا زمانہ مخالفین سے مقابلہ کرنے میں بسر ہوا اور ۷۸۶ھ میں وہ فوت ہوگیا ۔

شاہ شجاع، شاعری سے بھی خاص لگاؤ رکھتا تھا اور شاعر کی حیثیت سے وہ حافظ کا قدر دان تھا، لیکن سیاسی معاملات میں وہ حافظ کا ہمنوا نہ تھا اور آخر کار نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ عماد فقیہ کرمانی نے جس سے شاہ شجاع بہت مرعوب تھا، حافظ پر فتوائے کفر صادر کیا اور اگر اتفاق سے اسی زمانہ میں شاہ شجاع کی موت واقع نہ ہوجاتی تو یقیناً حافظ کی جان محفوظ نہ رہتی ۔

ہر چند شاہ شجاع کے بعد اس کے جانشینوں کے درمیان جنگ و نزاع کی وجہ سے طبقۂ زہاد و احتساب کا زور کم ہوگیا اور حافظ سے باز پرس کرنے والے بھی کمزور پڑگئے، تاہم اس کی زندگی بہت پریشانی میں گزری اور کوئی صورت اطمینان کی پیدا نہ ہوئی ۔ کیونکہ اس وقت بدقسمتی سے تاتاری فتنہ نے سر اٹھایا اور تیمور کی غارت و تاراج نے حافظ کو بہت غمگین و افسردہ کردیا، چنانچہ ان کا یہ شعر اسی ہنگامہ سے تاثر کا نتیجہ ہے :-

ازیں سموم کہ بر طرف بوستاں بگزشت
عجب کہ رنگِ گلے ماند و بوئے نسترنے

اس کے بعد حافظ کی اخیر عمر میں جب شاہ منصور کا تسلط شیراز پر ہوگیا تو فی الجملہ انھیں اطمینان ہوا ۔ شاہ منصور بڑا خوش خو، خوش فکر نوجوان تھا اور دلیری و جرأت میں بھی وہ تاریخ ایران کا منفرد فرمانروا سمجھا جاتا ہے ۔ شاہ منصور پہلے ہی سے حافظ کا معترف تھا اس لئے حافظ نے بڑے جوش سے اس کا خیر مقدم کیا ۔

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید

اور وہ قصیدہ نما غزل لکھی جس کا پہلا مصرع ہے :-

سحر چوں خسرو خاور علم بر کوہساراں زد

یہ زمانہ طوائف الملوکی کی باہمی جنگوں اور فتنۂ تاتار کی وجہ سے ایران کا بڑا تاریک و دردناک زمانہ تھا، سیاست و معاشرت کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا تھا، اجتماعی زندگی تقریباً ختم ہو چکی تھی، اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ ان حالات پر نقد و احتجاج کرے۔
لیکن اس وقت حافظ ہی کی ایک ہستی ایسی تھی جس نے قاضی و محتسب، مفتی و فقیہ، صوفی و زاہد کی گیر و دار کی پروانہ کرتے ہوئے اس کا ماتم نہ چھوڑا اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا کہ:-

فدائے پیرہن چاک ماہرویاں باد
ہزار جامۂ تقوی و خرقۂ پرہیز

حافظ کی یہی وہ آواز تھی، یہی وہ فریاد تھی جس نے ایران کے احساس کو بیدار کیا اور اسی لئے اہلِ ایران، حافظ کی پرستش کرتے ہیں۔

حافظ شیراز اور ان کے معاصرین

آٹھویں صدی ہجری جس میں حافظ شیراز پایا جاتا تھا، تاریخ ایران کا بڑا پرآشوب زمانہ تھا، اس صدی کے اوایل میں جانشینانِ چنگیز کے یہاں کے ملکوں کو برباد کرتے ہیں اور آخر میں تیمور لنگ کے حملوں سے ایران کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور طوایف الملوکی پھیل جاتی ہے۔ ایک طرف آل مظفر کا تسلط قایم ہو جاتا ہے، دوسری طرف الملک خانی، سربداری، چوپانی، اور اینجو حکومتیں وجود میں آجاتی ہیں اور ان سب کی باہمی کشمکش ایران کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔
ظاہر ہے کہ ان تمام حکومتوں میں ان کے پیشوایان مذہب، دینی علماء اور شعراء وغیرہ سبھی پائے جاتے تھے لیکن اس وقت ہمارا مقصود ان تمام حکومتوں کی تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس صدی میں حافظ شیراز کے معاصر شعراء کون کون تھے۔
تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصرینِ حافظ میں سے صرف پانچ شعراء قابل ذکر ہیں:- شاہ نعمت اللہ ولی، عماد فقیہ کرمانی، شیخ معین الدین احمد جامی، اوحدی مراغائی اور حافظ رازی۔

سید نور الدین نعمت اللہ بن عبد اللہ جو شاہ نعمت اللہ ولی کے نام سے مشہور ہیں ۷۳۰ھ میں بمقام کرمان پیدا ہوئے اور ۱۰۲ سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ یہ بڑی مذہبی اہمیت رکھتے تھے اور آٹھویں صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک سلسلۂ تصوف ہی "نعمت الٰہی" کے نام سے قایم ہوگیا اور بعد میں اس کی بہت سی شاخیں پیدا ہوگئیں۔
انھوں نے اپنی ساری عمر سفر و سیاحت میں بسر کی، سلاطین و علماء عصر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جہاں جاتے عوام و خواص سب ان کا خیر مقدم کرتے اور انتہائی عقیدت کے ساتھ تحایف پیش کرتے۔
انھوں نے اپنے بعد ایک بڑا دیوان چھوڑا جس کی ایک غزل یہ ہے:-

ما خاک راہ را بہ نظر کیمیا کنیم،   صد درد را بہ گوشۂ چشمے دوا کنیم
درحبس صورتیم و چنیں شاد و خرمیم   بنگر کہ در سراچۂ معنی چہا کنیم
موج محیط و گوہر دریائے عزتیم   ما میل دل بہ آب و گل خود چرا کنیم

اس غزل کے جواب میں حافظ شیراز نے بھی ایک غزل لکھی جس میں شاہ نعمت اللہ پر کافی طعن کیا گیا ہے:-

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
حالا درون پردہ بسے فتنہ می رود   تا آں زماں کہ پردہ برافتد چہا کنند
معشوق چوں نقاب زرخ برنمی کشد   ہرکس حکایتے بہ تصور چرا کنند

دردم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی ‌ ‌ ‌ ‌ باشد کہ از خزانۂ غیبش دوا کنند

شاہ نعمت اللہ نے اس طعن کا جواب ان اشعار سے دیا:۔

کو دل کہ بداند نفسے اسرارش ‌ ‌ ‌ ‌ کو گوش کہ بشنود ز من گفتارش

معشوق جمال می نماید شب و روز ‌ ‌ ‌ ‌ کو دیدہ کہ تا برخوردا ز دیدارش

حافظ اور شاہ نعمت اللہ کے درمیان یہ چشمک غالباً اسی جگہ ختم ہوگئی اور اس کا سلسلہ آگے نہیں بڑھا۔

عماد فقیہ کرمانی، مشہور صوفی تھے اور اپنے ہوا خواہوں اور مریدوں کی بڑی جماعت رکھتے تھے۔ انھوں نے ۷۷۳ھ میں بہ مقام کرمان وفات پائی۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی مشہور تھی کہ ان کی بلی ان کے پیچھے نماز پڑھتی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کرامت نے شاہ شجاع کو ان کا بہت گرویدہ بنا دیا تھا، حتیٰ کہ حافظ کو ان کے خلاف از روئے احتجاج یہ کہنا پڑا کہ:۔

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد ‌ ‌ ‌ ‌ بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اے کبک خوشخرام کہ خوش میروی بناز ‌ ‌ ‌ ‌ غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید ‌ ‌ ‌ ‌ شرمندہ رہروی کہ عمل بر مجاز کرد

شاہ شجاع خود بھی بڑا زاہد متقشف تھا اور عماد کا زبردست معتقد، لیکن حافظ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی اس لئے حافظ کے یہ اشعار اس پر بہت گراں گزرے اور اس نے چاہا کہ کسی نہ کسی بہانہ سے حافظ کو قتل کرا دے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

حافظ کے تیسرے معاصر شیخ جام تھے۔ شہرستان جام عرصۂ دراز سے مشایخ صوفیہ کا مرکز رہا ہے انھیں میں ایک سلسلہ احمد جام کا تھا اور اسی سلسلہ کے ایک شاعر و صوفی معین الدین محمد، حافظ کے معاصر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حافظ کو ایک بار خط لکھا اور "وعدہ و وعید فراواں" کے ساتھ دعوت صفائے نفس کی دی، لیکن حافظ نے اس کا جواب بہت سختی کے ساتھ یہ دیا کہ:۔

صوفی بیا کہ آئینہ صاف ست جام را ‌ ‌ ‌ ‌ تا بنگری صفائے مئے لعل فام را

راز درون پردہ ز رندان مست پرس ‌ ‌ ‌ ‌ کایں حال نیست زاہد عالی مقام را

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں ‌ ‌ ‌ ‌ کانیجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

حافظ مرید جام مے ست اے صبا برو ‌ ‌ ‌ ‌ از بندہ بندگی برساں شیخ جام را

اوحدی اور حافظ رازی بھی صوفی مسلک شاعر تھے اور معاصر حافظ ہونے کی حیثیت سے ان کا ذکر صرف اس نہج سے ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض اشعار غلطی سے دیوان حافظ شیراز میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہر چند یہاں تمام الحاقی اشعار کا ذکر تو ممکن نہیں لیکن بعض کا ذکر ضروری ہے۔

ذیل کی غزل دیوان حافظ شیراز کے تمام نسخوں میں پائی جاتی ہے:۔

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد ست ‌ ‌ ‌ ‌ بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد ست

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ‌ ‌ ‌ ‌ ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست

نصیحتے کنمت یاد گیر و در عمل آری ‌ ‌ ‌ ‌ کایں حدیث ز پیر طریقم یاد ست

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست

نشانِ عہد و وفا نیست در تبسم گل — بنال بلبل بیدل کہ جائے فریاد ست
چہ گویمت کہ بمے خانہ دوش مست و خراب — سروش عالم غیبم چہ مژدہ ہا داد ست
کہ اے بلند نظر شاہباز سدرہ نشیں، — نشیمن تو نہ ایں کنج محنت آباد ست
ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر — ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست

یہ غزل حافظ رازی کی ہے لیکن چوتھا شعر "مجو درستی عہد ــــ الخ" اوحدی کا ہے جسے حافظ رازی نے پیر طریقت کے الفاظ سے
د کیا ہے۔

اس غزل میں جہان کو سست بنیاد عجوزہ و محنت آباد ظاہر کیا گیا ہے اور جذبات یاس و نومیدی سے کام لیا گیا ہے جو
فظ شیراز کے فلسفۂ فکر کے منافی ہے۔ چونکہ یہ غزل حافظ شیراز کے زمانہ میں مشہور ہو چکی تھی اور ان کے پیام تغزل کے منافی تھی
س لئے اس کی تردید خود انھوں نے اس طرح کی:۔

برو بکار خود اے واعظ ایں چہ فریاد ست — مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتاد است
بکام تا نرساند مرا لبش چوں نائے — نصیحت ہمہ عالم بگوش من باد است
گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی ست — اسیر بند تو از ہر دو عالم آزاد است
اگرچہ مستی عشقم خراب کرد و لے، — اساس ہستی من زیں خرابی آباد ست
دلا منال ز بیداد عشق یار کہ یار — ترا نصیب ہمیں کردہ است و ایں داد ست
میان او کہ خدا آفریدہ است از ہیچ — دقیقہ ایست کہ ہیچ آفریدہ نکشادہ است
برو فسانہ مخوان و فسوں مدم حافظ — کزیں فسانہ و افسوں مرا بسے یاد است

مقطع میں حافظ سے مراد حافظ رازی ہے جس سے حافظ شیراز نے خطاب کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک امر خصوصیت کے ساتھ توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ حافظ شیراز شاعر خوشگو ضرور تھے۔ لیکن نہ انھیں کوئی
ں علمی مقام حاصل تھا نہ سیاسی حیثیت سے کوئی اہمیت رکھتے تھے نہ عوام ان کے ساتھ تھے اس لئے وہ نہ شاہ شجاع ایسے جابر و
فرمانروا سے ٹکرا سکتے تھے اور نہ شاہ نعمت اللہ، عماد کرمانی اور شیخ جام کی کھلم کھلا مخالفت کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ کوئی آواز
گوں کے خلاف بلند کرتے تو شاید ان کے کلام کا کوئی حصہ ہم تک نہ پہونچ سکتا۔

اس میں شک نہیں حافظ صوفیہ اور زہاد خشک کا مخالف تھا لیکن اس کی یہ مخالفت منفی قسم کی نہ تھی بلکہ وہ اسی کے ساتھ
نظریہ اپنا بھی پیش کرتا تھا اور وہ نظریہ مذہب عشق کا تھا چنانچہ لکھتا ہے:۔

عاشق شو ورنہ روزے کار جہاں سر آید — ناخواندہ نقش مقصود از کارگاہ ہستی

حافظ عشق کو جاوداں بتاتا ہے:۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اس کے نزدیک وہ شخص جو عشق سے بے بہرہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

ہر آں کسے کہ دریں حلقہ نیست زندہ بعشق — برو نمردہ بہ فتوائے من نماز کنید

وہ عشق کو سرنوشت انسان ظاہر کرتا ہے۔

مرا ازل عشق شد سرنوشت — قضائے نوشتہ نشاید ستود

عشق حسن سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کا پرتو ہے:۔

درازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد　　عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد

عشق ازلی و ابدی چیز ہے :-

ماجرائے من و معشوق مرا پایاں نیست　　آنچہ آغاز ندارد نہ پذیرد انجام

شمع کا ذکر کرتے ہوئے آتش عشق کے متعلق انھوں نے ایک بڑی لطیف بات کہی ہے۔ شمع کی آگ تو وہ ہے جو خارج سے اس میں پیدا کی گئی ہے اور بجھائی بھی جا سکتی ہے، لیکن پروانہ کی آگ وہ ہے جو اس کی ذات سے وابستہ ہے اور اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اس کا وجود باقی ہے :-

آتش آں نیست کہ از شعلۂ آں خندد شمع　　آتش آں ست کہ بر خرمن پروانہ زند

حافظ صاف صاف کہتے ہیں کہ مدرسہ و خانقاہ میں بیٹھ کر صوفی و زاہد کبھی اسرار عشق سے باخبر نہیں ہو سکتے :-

در خانقہ نہ گنجد اسرار عشق و مستی　　جام مئے مغانہ ہم با مغاں تواں زد

ز کنج مدرسہ حافظ مجوئے گوہر عشق　　قدم بروں نہ اگر میل جستجو داری

حافظ کے نزدیک رندی موہبت الٰہی ہے جو کسب و سعی سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

زاہد از راہ بہ رندی نبرد معذور ست　　عشق کارے ست کہ موقوف ہدایت باشد

حافظ کا معشوق

کوئی نامعلوم و مبہم ہستی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی متعین و مشخص ہستی ہے جسے وہ تو سے خطاب کرتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ اس تو کے سوا کسی اور کو عشق و پرستش کا مستحق نہیں جانتا۔

عرضہ کردم دو جہاں بر دل کار افتادہ　　بجز از عشق تو باقی ہمہ فانی دانست

حافظ اس تو کو ازلی و ابدی مانتا ہے۔

جز دل من کز ازل تا بہ ابد عاشق تست　　جاوداں کس نشنیدیم کہ در کار باند

حافظ اس تو کا غلام ہے اور ساری دنیا سے بے نیاز۔

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی ست　　اسیر عشق تو از ہر دو عالم آزاد ست

یہی تو وجود انسانی اور ساز و برگ ہستی کا باعث ہے اور اگر کوئی اس کی توجہ سے محروم ہے تو یہ خود اس کی کوتاہی و تقصیر ہے۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست　　ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

حافظ کا دیوان کیا اس کا ہر ہر شعر ایک مکمل داستان عشق ہے اور یہی حافظ کا حقیقی مذہب و مسلک ہے۔

دیوانِ حافظ اور تفاول

دیوان حافظ سے فال نکالنے کے حالات و واقعات بہت مشہور ہیں۔ انھیں میں سے ایک خاص واقعہ ایک دختر زرینہ پوش کا ہے جو ہر چند بعید از قیاس ہے، لیکن اختراع ذہنی کی ایک دلچسپ مثال ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی دوشیزۂ ایران لباس زریں میں آرامگاہ حافظ سے گزری تو اس نے سنگ مزار کے کنارے انتہائی عقیدت سے تفاولاً دیوان حافظ کھولا تو سب سے پہلا شعر یہ نظر آیا :-

سرمست در قبائے زر افشاں چو بگزری　　یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

یہ شعر دیکھ کر لڑکی حیران رہ گئی اور بولی کہ ایک کیا میں دو بوسوں سے بھی دریغ نہ کروں گی لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا اور چلی گئی۔

ایک سال گزرنے کے بعد وہ پھر مزار حافظ پر آئی اور دیوان کھولا تو یہ شعر نظر آیا :-

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوسہ بدہم　　وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم و نہ یک

لڑکی یہ شعر پڑھ کر بہت شرمندہ ہوئی اور بولی کہ اے حافظ اگر آپ میری اس غلطی کو معاف کر دیں تو میں دو کیا تین بوسوں سے بھی دریغ نہ کروں گی۔ لیکن اس پر عمل اس نے پھر بھی نہ کیا۔ چند دن بعد جب اس کا گزر پھر اس طرف ہوا اور اس نے دیوان حافظ کھولا تو یہ شعر نظر آیا :-

سہ بوسہ کز دو لبت کردہ ای وظیفۂ من　　اگر ادا نکنی قرض دار من باشی

یہ شعر پڑھ کر وہ بے اختیار ہو گئی اور خاک حافظ پر سیکڑوں نشانات بوسہ چھوڑ گئی۔

باب الانتقاد

اُردو کی دو نئی کتابیں

("آندھی میں چراغ" اور "نوائے پریشاں")

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

ندھی میں چراغ خواجہ غلام السیدین کا کارنامہ ہے۔ سیدین صاحب ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ وہ کئی اُردو کتابوں کے مصنف ہیں اور اُردو کے جدید نثر نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے ابدی قدروں سے بحث کی ہے، جن پر انسانی زندگی کے شرف و معنی کا دارومدار ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہبی ماؤں کی تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے حصہ میں ان شخصیتوں کا ذکر ہے جن سے مصنف کے ذاتی مراسم رہے ہیں اور جنھوں نے الفت کی آندھیوں میں بھی بنیادی انسانی قدروں کے چراغوں کو روشن رکھا ہے۔ تیسرے حصہ میں ملک اور قوم کے نئے تقاضوں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں اعلیٰ انسانی قدروں کا کیا مقام ہونا چاہئے۔ کتاب نہایت فکر انگیز تمہید شروع ہوتی ہے۔ مصنف نے زور دیا ہے کہ انھوں نے جن قدروں کو افراد کی سیرت میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے دراصل ایسے چراغ ہیں جن کی روشنی میں ایک صالح زندگی کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔

سیدین صاحب کا بیان ہے:۔

> "مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ بعض اعتبار سے ملک نے گزشتہ پندرہ سال میں کافی ترقی کی ہے، زراعت میں صنعت و حرفت میں، آب پاشی میں، تعلیم اور صحت میں، لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ تمام ترقی مجھے سطحی اور کم عیار معلوم ہوتی ہے جب تک اس کی بنیاد سچی اور اخلاقی قدروں پر نہ رکھی جائے۔ ہماری تہذیب اور مذہب نے ہمارے عوام کی شرافت اور امن پسندی نے صدیوں کی کوشش سے جو چراغ جلائے تھے اور صدیوں تک روشن رکھے تھے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک خوفناک آندھی کی جھپٹ میں آگئے ہوں.... ملک کی عام ذہنی اور اخلاقی حالت کو دیکھ کر بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ دو سو برس کی غلامی کے اثر نے قوم کے دل اور دماغ کو ایک حد تک مسخ کر دیا ہے اور ان میں سے خوب اور ناخوب کی تمیز اٹھ گئی ہے"۔

یہاں یہ سوال دلچسپ ہے کہ یہ خوفناک آندھی کیوں شروع ہوئی۔ ہم اپنی روح کی دولت کیوں کھو بیٹھے ہیں۔ ہم اپنی تہذیبی اور اخلاقی دوں سے کنارہ کش کیوں ہوتے جاتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ ہماری مادی محرومیاں تو نہیں جو جہالت، غریبی، بیماری، بے روزگاری کی شکل سر اٹھاتی ہیں۔ سیدین صاحب کا خیال ہے کہ مادی دولت کے ساتھ ساتھ روحانی دولت کو بھی ہاتھ سے جانے دینا زوال کی انتہا ہے کو سنوارنے کے لئے ضروری ہے کہ اخلاقی اصولوں اور شرافتوں کو شمع راہ بنایا جائے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ:۔

> "مادی اور روحانی کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف یا متضاد صفتوں یا صلاحیتوں کی ضرورت نہیں۔ محنت

ایمانداری، انصاف، حق پرستی، انسان دوستی، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکتی ہیں۔"

سیدین صاحب کے نزدیک مادی کامیابی بجائے خود مقصود حیات نہیں۔ مادی دولت اور صنعت و حرفت کی اہمیت اس لئے ہے کہ ان سے کام لے کر انسان اپنی زندگی کو بنائے اور سنوارے اور دُنیا کو رہنے کے قابل جگہ بنائے۔ مادی کامیابی محض ذریعہ ہے ایک مقصد کا اور ذریعہ کو مقصد سمجھنا سخت غلطی ہے۔ مصنف نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ "زندگی کی اصل دولت روپیہ ہے نہ کارخانے نہ مکان نہ ساز و سامان نہ تمدن کے مادی اور مشینی آلات۔ اس کی اصل دولت افراد ہیں اور افراد کی دولت ان کے دل و دماغ کی جولانی ان کے دل کا گداز، ان کی قدر شناسی اور ان کی خوب تر کی جستجو۔" گویا اصل چیز فرد کی شخصیت کا بھرپور ارتقاء ہے۔ یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہم اچھی قدروں کو نہ پہچانتے ہوں اور انھیں اپنی شخصیت کا جزنہ بنالیں۔ سیدین صاحب، فرد کی عظمت اور شرافت کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس مسئلہ کو بھی اُٹھایا ہے کہ اس پیچیدہ نظام میں فرد کو اس کا صحیح مقام کیسے حاصل ہو۔ جدید سماج میں اُسے کئی طرح کے خطرے درپیش ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے مصنف نے سب سے زیادہ زور اقبالؔ کی طرح خودی کے استحکام پر دیا ہے۔ فرد کی صحیح نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ :۔ "خودی کو عقل اور عشق دونوں کے ہتھیاروں سے محکم کیا جائے تاکہ اس کے قدم شرافت، انصاف، امن اور خود داری کے راستے سے نہ ڈگمگائیں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ استحکام خودی کا یہ فلسفہ ہندوستانی روح یا ملکی مزاج سے کیا مناسبت رکھتا ہے؟ کیونکہ اگر ہندوستانی ذہن اس کا ساتھ دینے کو طیار نہیں تو یہ محض الفاظ کا طلسم بنا رہے گا اور عوام کے دلوں میں جگہ نہ پکڑ پائے گا۔ ہندوستان میں صدیوں سے خودی کی نہیں بلکہ نفی خودی کی تربیت دی جاتی رہی ہے۔ ہندوستانی فلسفہ کی رو سے وجود حقیقی صرف خدائے مطلق کا ہے، کائنات چونکہ محض جلوہ گاہ صفات ہے اسلئے صفات کا ذات باری سے ہٹ کر کوئی وجود ہی نہیں۔ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے، فریب حواس اور طلسم نظر ہے۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

کثرت حقیقی نہیں، صرف وحدت کی جلوہ سامانی ہے اور زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ محدود نفس کی خودی کو جو محدود سے وابستگی کا دوسرا نام ہے، فنا کر کے لامحدود سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ نفی خودی کے اسی فلسفہ سے ہندوستانی ذہن نے بعض اعلیٰ انسانی اقدار کا سبق سیکھا ہے۔ مثلاً رواداری، امن پسندی، دوسروں کے عقاید کا احترام کرنا اور مختلف مذہبوں یا نظریوں، اور مظاہر فطرت کی کثرت میں ایک بنیادی وحدت کو کار فرما دیکھنا وغیرہ۔ لیکن اسی فلسفہ کے منفی پہلو بھی ہیں جو ہندو... کو بے عملی، ترک دُنیا اور خشک روحانیت کی طرف لے جاتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بے عملی کے حد سے بڑھے ہوئے رجحان کو روکنے کے لئے عمل کی اہمیت پر زور دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گیتا کے فلسفہ کی شان نزول یہی ہے۔ موجودہ دور میں جب صدیوں کی غلامی کے بعد عملی قوتوں کا شعلہ سرد پڑ چکا تھا، ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ویدانت کی نئی تفسیر... کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اثبات عمل پر دیا ہے اور بتایا ہے کہ تاکید دُنیا کو ترک کرنے کی نہیں، دُنیا کی محبت کو ترک کرنے کی ہے یعنی مادی آسایشوں کے حصول میں بجائے خود کوئی قباحت نہیں اگر وہ روحانی اقدار پر غالب نہ آجائیں۔ غرض نفی خودی کا یہ فلسفہ بھی اثبات عمل کی جس منزل تک لے جاتا ہے وہاں سے فلسفۂ استحکام خودی کی راہیں زیادہ دور نہیں۔ سیدین صاحب کے شعور اقدار کو جو چیز ہندوستانی ذہن سے اور بھی قریب لے آئی ہے وہ ان کا کافی بالذات خودی کے خطروں سے آگاہ کرنا ہے۔ انھوں نے فلسفۂ اقبالؔ کے دوسرے پہلو پر بجا طور پر زور دیا ہے یعنی "دوسروں کی خودی کا احترام، جب تک ہم دوسروں کی خودی کا سچا احترام کرنا نہ سیکھیں گے ان کے لئے خیالات، عقاید اور اعمال کی (خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں) وہی آزادی نہیں چاہیں گے جو اپنے لئے چاہتے ہیں، ہماری اپنی خودی بھی پھل پھول نہیں سکتی۔"

کتاب کے دوسرے باب میں سیدین صاحب نے جن شخصیتوں کو پیش کیا ہے ان میں مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبالؔ

خواجہ غلام الثقلین، شری جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین سبھی شامل ہیں۔ مصنف نے خود اس کا اقرار کیا ہے کہ مختلف مضامین مختلف قتوں میں لکھے گئے تھے۔ اور یہی ان کے عدم تناسب اور بے ربطی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ان میں اگر کوئی ربط ہے تو یہی کہ ان شخصیتوں کے ذریعہ سے مصنف نے اعلیٰ انسانی قدروں کی وضاحت کرنی چاہی ہے۔ قدروں کی بحث اگر براہ راست کی جاتی تو خشک ہو جاتی۔ سیدین صاحب نے سیرت کشی سے مدد لے کر اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ کتاب دلچسپ ہو گئی ہے۔ مصنف نے شریف قدروں کو جہاں کہیں بالواسطہ طور پر پیش کیا ہے، اُن کی بات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اس لحاظ سے "انسان کامل" اُن کا بہترین مضمون ہے۔ لیکن بعض مضامین میں جہاں وہ خوبیوں کو ایک ایک کر کے گنواتے ہیں، یہ بات پیدا نہیں ہو پائی۔ انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کا مقصد سیرت کا تجزیہ اور تمام خوبیوں اور کمزوریوں کی جانچ ہے لیکن ان کا یہ دعوائے تمام و کمال صحیح نہیں کیونکہ بعض مضامین یقیناً اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ وہ سیرت کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیں۔ ان میں اور مختصر مضامین میں بڑا فرق ہے جس سے کتاب کی ترتیب اور حسن تناسب میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ دوسرے حصّہ کے زیادہ دلکش مضامین وہی ہیں جو ان شخصیتوں کے بارے میں ہیں جن سے مصنف کا تعلق نہایت گہرا رہا ہے اور جنھیں انھوں نے نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ سیدہ خاتون پر ان کے مضمون کو شاہکار کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون نہیں، نوکِ قلم سے ٹپکا ہوا آنسو ہے جس کی تھرتھراہٹوں میں محبت کا نورانی پیکر لرزتا ہوا نظر آتا ہے۔ چند سطریں ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ سیرت کشی میں بھی لفظ و معنی کی دو دئی مشاطئی جا سکتی ہے۔ آنکھیں الفاظ پر نہیں رُکتیں ایک ایسے لازوال کردار کو دیکھنے لگتی ہیں جو انسان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ "ذہانت کے ساتھ ساتھ سیدہ کے پاس محبت کا اسمِ اعظم تھا، اسی محبت کا فیض تھا کہ اس کم عمری میں اس نے ایک ایسا کارنامہ دکھایا جو آج تک مجھے حیرت میں ڈالتا ہے۔ خدا کی قدرت اور محبت کا پورا اندازہ ایک عورت کے دل کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ بچپن میں اس کے مزاج میں کسی قدر تیزی اور زود رنجی تھی، لیکن جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا گیا، اس میں گھلاوٹ اور شیرینی اور سکون زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ماں کے انتقال کے بعد اس کی طبیعت اس قدر مستحکم اور اس کے دل کی محبت ایسی انتہاہ ہو گئی تھی کہ اگر تمام دُنیا کے دکھ درد کا بوجھ اس پر ڈال دیا جاتا وہ خندہ پیشانی کے ساتھ سہ لیتی اور اُف نہ کرتی! جب آزمائشوں اور پریشانیوں کی کثرت زندگی کو ناگوار اور تلخ بنا دیتی تو اس کا ہنستا ہوا خوبصورت چہرہ اور نیلگوں آنکھیں دل کے بار کو اس طرح دور کر دیتی تھیں جس طرح سورج کی روشنی رات کی تاریکی کو کافور کر دیتی ہے۔ مگر قدرت کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں اپنی صلیب تنہا اٹھائے اور کسی رفیق صادق کی مدد اور محبت اس کی منزل کو آسان نہ کرے۔"

یہ کتاب شخصیت نگاری نہیں، یہ محض فلسفیانہ اور نظریاتی بھی نہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ سب کچھ ہے۔ اس کی خوبی جس کی بدولت اس کی مقبولیت کے چمن پر ہمیشہ بہار رہے گی، اس کا ادبی حُسن ہے۔ کسی تخلیق میں اگر ادبی حُسن نہیں تو خواہ اس کا موضوع کتنا ہی اعلیٰ اور ارفع ہو، وہ ادبی قرار نہیں پائے گی۔ سیدین صاحب کی نثر میں شگفتگی اور اثر آفرینی ہے، گو انھوں نے کہیں تقریر کا سا انداز اختیار کیا ہے جو ایک علمی کتاب سے مناسبت نہیں رکھتا۔ انھوں نے اچھے اشعار کی پیوند کاری سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن نظریاتی مباحث میں اشعار کی کثرت خیال کے تسلسل میں مزاحم ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ کثرت استعمال سے بعض عمدہ اشعار اپنی لطافت سے محروم بھی ہو سکتے ہیں۔ سیدین صاحب کی نثر نہ زیادہ شوخ ہوتی ہے نہ بے رنگ، یہ نہ تو بامزہ ہے اور نہ پھیکی سیٹھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خیال کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے، اعتدال و توازن کی راہ پر رہتی ہے اور اس میں ادبی چاشنی اور شگفتگی ہوتی ہے جس سے بات دل تک اُتر جاتی ہے اور اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ سیدین صاحب کی نثر اپنی سنبھلی کیفیت اور متانت کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ لیکن جہاں کہیں جذبات نے تخیل کو ایڑ لگا دی ہے، الفاظ بھی پُر افشاں نظر آتے ہیں، آزاد سے متعلق ان کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:-

"مولانا آزاد کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب تاریخ اپنی سخت گیر کسوٹی پر ان کی اور ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور کارناموں کو پرکھے گی۔ ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں، کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جنہیں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں اور جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؟"

اقبال کے پیغام سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"کوئی سبق، کوئی پیغام، فکر کی کوئی یاترا، مذہب کا کوئی اصول اس قدر اہم نہیں جتنا یہ سیدھا سادا، پہاڑوں جیسا پرانا سمندر جیسا گہرا، سورج جیسا روشن، گلاب جیسا شگفتہ پیغام کہ اپنے دل اور دماغ کے دروازوں کو کھول دو، تاکہ تعصب اور تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف ہو جائیں، تاکہ انسان، انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے تاکہ محبت کی دھیمی روشنی اور ٹھنڈی ہوا بند غنچوں کو پھول بنا دے، تاکہ انسان ایک دوسرے کا خون پینے کی بجائے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بننا سیکھیں۔"

غرض "آندھی میں چراغ" اردو ادب میں ایک شائستہ اضافہ ہے۔ سیدین صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے۔ "قابلِ رشک ہے وہ شخص جس کو خدا نے حکمت دی ہو، جو اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔" چنانچہ سیدین صاحب نے جس حکمت پر خود عمل کیا ہے، اس کے پیغام کو عام کرنے کی سعی کوشش کی ہے اور اس کی کامیابی کی ضمانت خود ان کی ذات ہے کیونکہ "اثر صرف بات کی سچائی کا نہیں بلکہ کہنے والے کی ذاتی سچائی کا بھی ہوتا ہے۔"

یہ کتاب انڈین اکاڈیمی نئی دہلی نے بڑے حسن اہتمام کے ساتھ شایع کی ہے۔

نوائے پریشاں

جگن ناتھ آزاد کا شمار اردو کے صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ جدید شاعروں کی کوئی سی فہرست بنائیے اور انتخاب کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔ آزاد کا نام اس میں ممتاز نظر آئے گا۔ لیکن وہ ہمارے ان نئے شاعروں میں نہیں جن کی شاعری کے پاؤں زمین پر ہیں، سر آسمان میں۔ آزاد نے روایت سے اپنے رشتہ کو مضبوط رکھا ہے اور اس سے ان کے کلام میں ایک اعلیٰ سنجیدگی اور متانت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے قدم قدم پر فکر و نظر کے نئے چراغ جلائے ہیں اور اپنے ذہنی دریچوں کو نئی روشنی اور نئی ہواؤں کے لئے ہمیشہ کھلا رکھا ہے۔ نوائے پریشاں ان کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے جس میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں سبھی کچھ شامل ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ نظمیں ہی ہیں۔ آزاد نے کلام اقبال کے بعض عناصر کو جذب کر لیا ہے۔ ان کے انداز بیان اور رعنائی خیال پر نظر ڈالئے تو اقبال کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوگا۔ اشعار رواں دواں، بندشیں چست، الفاظ کا زیر و بم، پرکیف غنائیت اور معنی کی تہیں ایک ایک کر کے کھلی ہوئی معلوم ہوں گی۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "دیارِ محبوب کو جاتے ہوئے" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

اب تو ہے بات کوئی دم کی جب لے خم بہ کنار ۔۔۔ آئے گی کیف لٹاتی ترے گلشن میں بہار
اپنی ہی نیند میں ہے مست جوانی جس کی ۔۔۔ ایک ندی کی روانی ہے روانی جس کی
ایک بدلی ہے کہ برسات بھری ہے جس میں ۔۔۔ ایک نشہ ہے عجب بے خبری ہے جس میں
اک تخیل کہ ابھی ذہن پہ اترا ہی نہ ہو ۔۔۔ اک کرن جس نے افق کو ابھی دیکھا ہی نہیں
اک تبسم کہ لبوں پر ابھی آیا ہی نہ ہو ۔۔۔ ایک نغمہ کہ جسے ساز نے پایا ہی نہ ہو
پھر ترے ساز محبت پہ سنائی دے گا ۔۔۔ تجھ کو پھر عالم گم گشتہ دکھائی دے گا

زبان و بیان کا یہ حسن جسم و جمال کی کیفیتوں سے مل کر کہیں کہیں سحر آفریں ہوگیا ہے۔ ان کی نظم "نووارد" میں جو رچی ہوئی شعریت اور دلنواز موسیقیت ہے، وہ انھیں امکانات کا پتہ دیتی ہے۔

آزاد نے وطن سے دوری پر آنسو بھی بہائے ہیں اور وطن کی محبت سے سرشار ہو کر ترانے بھی گائے ہیں "جمنا کے کنارے" "اے کشور ہندوستان" اور "گاندھی" میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن آزاد اپنی بیانیہ نظموں کی بہ نسبت ان نظموں میں زیادہ کامیاب ہیں جہاں زندگی کے کسی ایک رُخ سے نقاب اُٹھائی گئی ہے۔ ایسی نظموں میں انھوں نے اپنی غزل گوئی کی صلاحیتوں سے بھی پورا پورا فایدہ اُٹھایا ہے اور خیال کو جذبے کی مہک میں بسا کر پیش کیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسی نظمیں بہت کم ہیں لیکن "ارتقا" نے اسی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

آزاد غزلوں میں خلوص کی چاندنی اور ان کے درد آشنا دل کی پکار ملتی ہے۔ لیکن وہ نوحہ گر کو ساتھ نہیں رکھتے اور بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں۔ وہ عظمتِ آدم کے قایل ہیں۔ ان کی نظر انسان کے مستقبل پر ہے اور وہ زندگی میں لامحدود امکانات سے مایوس نہیں۔ اُن کے تصورِ عشق میں بھی ایک دلنواز نشاط اور بے نیازی ملتی ہے، اس میں کہیں کسی قسم کی شدت اور محرومی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی فضا اتنی وسیع بھی نہیں کہ انسان کھو جائے اور اتنی سکڑی ہوئی بھی نہیں کہ غمِ ذات خلاصۂ کائنات بن کے رہ جائے۔ آزاد کے تصورِ عشق میں ایک اعتدال، ایک صحت مندی اور ایک نارمل انسانی کیفیت ملتی ہے جس کا اظہار کبھی کبھی اشعار میں بھی ہوا ہے

اک عشق والہانہ کبھی زندگی سے تھا
اب زندگی سے پیار کبھی ہے کبھی نہیں
ہر لحظہ اب نہیں ہے مجھے تیرا انتظار
اب تیرا انتظار کبھی ہے کبھی نہیں
یہ کیا مقام ہے کہ تری بے وفائی پر
آزاد شرمسار کبھی ہے کبھی نہیں

اپنی اس کار آگہی اور صحت مند بے نیازی کی بدولت یہ مجموعۂ کلام ہمیشہ عزیز رہے گا۔

خون کی خرابی کو دور کیجئے

صافی

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں صافی کا ایک چمچہ آپ کو خون کی خرابی سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں سے بچائے گا۔ صافی نظام عصبی میں توازن پیدا کرتی ہے۔ خون کی نالیوں کو صاف کرتی ہے۔ داغ دھبے اور چھائیوں کو دور کر کے چہرے کو گلاب کی پنکھڑی کی طرح دلکش اور خوبصورت بناتی ہے۔

ہمدرد

دہلی - کانپور - پٹنہ

باب الاستفسار

(۱)

مہارانا اُدے پور اور خاندان مغلیہ سے رشتۂ ازدواج

چتوڑ اور مرہٹہ سے سادات حسینی کا نسبی تعلق

(سید جمیل الدین - سہارنپور)

مشہور ہے کہ ہندوستان کے راجپوت خاندان کے فرمانرواؤں میں صرف مہارانا ادے پور ہی ایسا فرمانروا تھا جس نے اپنے خاندان کی کسی لڑکی کی شادی مغلیہ خاندان کے شاہزادوں سے پسند نہیں کی۔ کیا یہ بات درست ہے؟

(نگار) مشہور یہی ہے جو آپ نے لکھا۔ مولانا آزاد نے دربار اکبری میں بھی یہی لکھا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسی پر اعتماد کرکے سب نے یہ یقین کر لیا ہو کہ مہارانا اُدے پور نے مسلمان بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔

وصایائے اورنگ زیب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی ایک رفیقۂ حیات جس سے وہ بہت مالوف تھا، اُدے پور ہی کی لڑکی تھی۔ چنانچہ اپنے پانچویں بیٹے محمد کام بخش کو ایک خط جو وقت آخر میں لکھا تھا اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ "حال بیگم بیگم دانند۔ اُدے پوری کہ والدۂ شماست کہ در بیماری با من بودہ ارادۂ رفاقت دارد"۔

اس سلسلہ میں خزانۂ عامرہ، میر غلام علی آزاد بلگرامی کا ایک بیان بڑا دلچسپ ہے لکھتے ہیں کہ:- "رانائے اُدے پور اپنا نسب نوشیرواں کسریٰ تک پہونچاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ جب سعد وقاص نے ایران فتح کیا تو نوشیرواں کی اولاد منتشر ہوگئی، انھیں میں سے ایک فرد ہندوستان آیا اور رانائے اُدے پور کے مرتبہ تک پہونچا"۔

اس روایت کا ماخذ غالباً آئین اکبری ہے جس میں چتوڑ کے متعلق لکھا ہے کہ "سردار بومی راہپشیر رادل گفتے وازدیر باز رانا گویند از قوم گہلوت خویشتن را از نژاد نوشیرواں عادل برشمارد"۔

اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فرمانروایان چتوڑ، سادات حسینی کے خالو اور ماموں تھے۔ کیونکہ جناب شہر بانو بھی یزدگرد نبیرۂ نوشیرواں عادل کی صاحبزادی تھیں جو امام حسین سے بیاہی گئیں اور ان کے بطن سے جناب زین العابدین پیدا ہوئے جو سادات حسینی کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

اس کی تائید و تصدیق ڈاکٹر ولیم ہوئی (Dr William Hoey) کی کتاب تذکرہ دہلی و فیض آباد سے بھی ہوتی ہے جس میں بہ حوالہ تاریخ فرح بخش لکھا ہے کہ مورخین نے سنتا پسر سیواجی کے اجداد و اسلاف کا سلسلۂ نسب نوشیرواں تک پہونچایا ہے اور وہ اس طرح کہ اُدے پور کے رانا سنتا کے رشتہ دار تھے، بعد کو سنتا کا پردادا اپنے بھائیوں سے بگڑ کر اُدے پور سے چلا آیا اور دکن میں

بمقام مرہٹ قیام گزیں ہوا اور اسی وجہ سے وہ مرہٹہ کہلایا۔

الغرض اس طرح مرہٹہ اور رانایان اُدے پور بھی جو ایک ہی نسل سے تھے، سادات حسینی سے نسبی تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو۔

---

(۲)

شاہ دولا کے چوہے

(میر باسط علی صاحب - رائے پور)

بعض لوگوں کو جو بہت چھوٹے سر کے ہوتے ہیں اور احمقانہ باتیں کرتے ہیں، شاہ دولا کے چوہے کہلاتے ہیں، اس کی کیا اصلیت ہے؟

(نگار) جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانہ میں ایک مشہور بزرگ پیر شاہ دولا دریائی گجرات میں پائے جاتے تھے اور آپ کے مریدوں کی بڑی تعداد تمام پنجاب میں پائی جاتی تھی، نذر و نیاز کی صورت میں آپ کو اتنا کچھ ملتا تھا کہ آپ نے بہت سے تالاب کھدوائے، مسجدیں تعمیر کرائیں، پل بنوائے۔ ۱۶۷۶ء میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ دولا کے چوہے انھیں کی کرامات سے تعلق رکھتے ہیں، حالانکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس زمانہ میں جو بچے مسخ شدہ یا ناقص العقل پیدا ہوتے تھے انھیں آپ کی خانقاہ میں بھیجدیا جاتا تھا اور ان کے والدین ان سے گدائی کا کام لیتے تھے، چونکہ چوہوں کی طرح ان کے سر چھوٹے اور کان لمبے ہوتے تھے اس لئے وہ شاہ دولا کے چوہے کہلانے لگے۔

---

(۳)

نوروز اور عہدِ مغلیہ

(سید علی حسین صاحب - مبارکپور)

کیا جشن نوروز عہد مغلیہ میں بھی منایا جاتا تھا؟

(نگار) جشن نوروز کا تعلق موسم بہار سے ہے جو ۲۲ یا ۲۳ مارچ سے شروع ہوتا ہے اور تمام ایشیا (خصوصیت کے ساتھ ایران) میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے کیونکہ یہ دراصل مجوس قوم کا تہوار ہے۔

شاہان تیمور میں اکبر بڑے اہتمام سے یہ جشن مناتا تھا۔ مولانا آزاد نے دربار اکبری میں اس کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اٹھارہ دن تک اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور محافل نشاط گرم رہتی تھیں۔ عہد جہانگیر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن شاہجہاں نے اس رسم کو اٹھا دیا اور عالمگیر نے سختی سے اس کو روکا، چنانچہ شاہزادہ محمد معظم بہادر شاہ کو ایک خط میں لکھا کہ: "از عرض بے غرضے ظاہر شد کہ امسال نوروزے بہ طور اہل ایران بہ تکلف کردہ اند، بفضل الٰہی عقاید خود درست دادند، این بدعت تازہ از کہ آموختہ اند۔ بہر حال چوں ایں روز از اعیاد مجوس ست و باعتقاد ہنود روز جلوس بکرماجیت، بہ عمل نیاید و چنیں جہالت بہ فعل نہ گراید۔"

لیکن اورنگ زیب کے بعد پھر یہ رسم جاری ہوگئی۔

(۴)

کتب احادیث و تفاسیر کی جمع و ترتیب

(مولوی علی الدین صاحب - سہارنپور)

کتب احادیث میں چھ کتابوں کو خاص شہرت حاصل ہے جنھیں صحاح ستہ کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی اور بہت سی کتب احادیث مرتب کی گئی ہیں لیکن ان کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ صحاح ستہ کی جمع و ترتیب کس زمانہ میں ہوئی اور اس سے قبل و بعد جو کتب احادیث مرتب ہوئیں ان کا زمانہ کیا تھا اور ان میں کس کو کیا اہمیت ہے، اسی طرح تفسیروں کی بابت معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان کا لکھا جانا کب سے شروع ہوا اور کتنی اہم تفاسیر کب لکھی گئیں۔

(نگار) آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ احادیث نبوی کی جمع و تحریر رسول اللہ اور صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوئی کیونکہ رسول اللہ اس کو پسند نہ فرماتے تھے کہ ان کے اقوال و ارشادات کو قرآن کی طرح لکھ کر محفوظ کر لیا جائے محض اس اندیشہ سے کہ مبادا وہ بھی قرآن کا جزو سمجھ لئے جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ربیع بن صبیح نے بصرہ میں جمع احادیث کا کام شروع کیا، لیکن یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے، کیونکہ دراصل اس خدمت کو سب سے پہلے امام مالک بن انس نے انجام دیا جن کے مجموعۂ احادیث کو موطا کہتے ہیں۔ یہ ۹۰ھ یا ۹۶ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں وفات پائی جبکہ انکی عمر ۸۵ سال کی تھی، خلیفہ منصور عباسی ہی کے زمانہ میں ان کے علم و فضل اور زہد و تقوی کا شہرہ ہو چکا تھا۔ یہ وقت وہ تھا جب ۱۴۵ھ میں محمد بن عبد اللہ نے عباسیوں کے خلاف خلافت کا دعوی کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام مالک دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں جمع احادیث کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اس سے قبل کسی نے یہ خدمت انجام نہیں دی تھی۔

آپ نے زیادہ توجہ انھیں احادیث کی طرف کی جن سے فقہی احکام اخذ کئے جا سکتے تھے اور اس طرح انھوں نے مالکی فقہ کی بنیاد ڈالی جس کے ماننے والے اب بھی مصر و افریقہ میں موجود ہیں۔

اس کے بعد تاریخ کے لحاظ سے امام شافعی اور ابوداؤد طیالسی کا نام سامنے آتا ہے جنھوں نے ۲۰۴ھ میں انتقال کیا اور جن کی مسندات کا ذکر کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے ـــــــــــ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور متعدد کتب احادیث مسند و سنن کے نام سے لکھی گئیں۔ مثلاً مسند الحمید (امام ابوبکر عبد اللہ کی)، سنن سعید بن منصور (حافظ سعید بن منصور کی)، مسند مستدد (ابوالحسن مستدد کی)، مسند اسحاق (حافظ ابویعقوب اسحاق کی) مسند احمد (امام احمد بن محمد بن حنبل کی)، نوادر الاصول (امام ابوعبد اللہ محمد بن علی الترمذی کی)، سنن دارمی (عبد اللہ الدارمی کی)، اور یہ تمام محدثین ۲۱۹ھ سے لے کر ۲۵۵ھ میں ختم ہو گئے۔ لیکن بعد کو اسی تیسری صدی ہجری میں وہ مشہور محدثین سامنے آئے جن کی کتابیں صحاح ستہ کے نام سے موسوم ہیں۔

ان میں سب سے پہلے امام بخاری ہیں جن کی کتاب جامع الصحیح خاص شہرت رکھتی ہے، ان کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا، اس کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے، اس کے جامع حافظ ابوالحسین مسلم کا انتقال ۲۶۱ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ابوعبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ کی سنن ابن

ن کا انتقال ۲۷۳ھ میں ہوا۔ صحاح ستہ میں چوتھی کتاب سنن ابوداؤد ہے (سلیمان بن اشعث کی) جنھوں نے ۲۷۵ھ میں انتقال کیا۔ پانچویں کتاب حافظ ابوعیسیٰ ترمذی کی جامع صحیح ہے، ان کا انتقال ۲۷۹ھ میں ہوا۔ چھٹی کتاب حافظ ابوعبدالرحمان کی سنن نسائی ہے، ان کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا۔

آپ دیکھیں گے کہ صحاح ستہ کی جمع و ترتیب تیسری صدی ہجری میں ہوئی اور یہ تمام محدثین قریب قریب ہمعصر تھے، اور یہ درمیانی دور تھا خلفاء عباسیہ کا، المعتمد سے لے کر المقتدر تک۔

اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ برابر جاری رہا اور چوتھی صدی ہجری میں درجنوں کتب احادیث لکھی گئیں جن میں سب سے آخری سنن دارقطنی ہے جس کے جامع حافظ بغدادی نے ۳۸۵ھ میں انتقال کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں یہ زور کم ہوگیا۔ پھر بھی مستدرک، حاکم نیشاپوری کی (وفات ۴۰۵ھ) جسے دراصل چوتھی صدی ہی کی چیز سمجھنا چاہیئے، اور سنن الکبیر بیہقی کی (وفات ۴۵۸ھ) خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ چھٹی صدی ہجری میں صرف ایک کتاب "تاریخ ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ) قابل ذکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

چھٹی صدی سے لے کر آٹھویں صدی تک حدیث کی کوئی قابل ذکر کتاب مرتب نہیں ہوئی اس کے بعد نویں صدی میں البتہ جلال الدین سیوطی نے "طبقات ابن سعد" لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔

کتب احادیث میں صحیح بخاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہاں تک کہ قرآن کے بعد اس کا نام لیا جاتا ہے اور بلا شبہ امام بخاری کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم بلا استثناء اس کی تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرلیں، چونکہ شعائر و عقاید اور معاملات و عبادات کے علاوہ جن احادیث کا اسرائیلیات اور اخبار عن الغیب یا مابعد الطبیعیاتی تصریحات سے تعلق ہے، انھیں اصول درایت پر جانچ لینا ضروری ہے اور اس میں کوئی مضایقہ نہیں اگر اس طرح ہم بخاری کی بعض احادیث کے ماننے سے انکار کردیں۔

تفاسیر تفسیروں کی تدوین بھی دوسری صدی ہجری سے شروع ہوئی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے امام شافعی کی "احکام القرآن" ہمارے سامنے آتی ہے۔ شافعی کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا۔

تیسری صدی ہجری کی کتب تفاسیر میں طبری (وفات ۳۱۰ھ) کی تفسیر بہت اہم ہے لیکن رطب و یابس سے پاک نہیں، اس صدی میں چند اور تفاسیر بھی لکھی گئیں جو زیادہ مقبول نہ ہوسکیں۔ اس کے بعد پانچویں صدی کے اخیر میں البتہ علامہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) نے تفسیر کشاف لکھ کر کچھ کام کی باتیں کہیں لیکن چونکہ وہ معتزلی مشہور تھے اس لئے علماء ظواہر نے اس پر کافی نکتہ چینی کی۔

چھٹی صدی میں رازی (متوفی ۶۰۶ء) نے تفسیر کبیر لکھی جو بڑی حد تک مدلل و معقول ہے۔ ساتویں صدی ہجری کی تفاسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کو خاص اہمیت حاصل ہے (بیضاوی کا انتقال ۶۸۵ھ میں ہوا اور تفسیر مدارک کے مصنف عبداللہ بن محمود نسفی کا ۷۱۰ھ میں)۔ آٹھویں صدی ہجری کی تفاسیر میں صرف ایک تفسیر حافظ ابوالفداء دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) کی تفسیر ابن کثیر، قابل ذکر ہے، گو وہ بھی دور از کار روایات کا مجموعہ ہے۔ نویں صدی ہجری میں تفسیر جلالین لکھی گئی جو درس نظامی میں اب بھی شامل ہے۔ اس کو جلالین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے دو مصنف ایک ہی نام کے تھے، پہلے جلال الدین محلی (متوفی ۸۶۴ھ) نے سورۂ اسراء تک اس کو مرتب کیا اور پھر سالہا سال بعد جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے اسے پورا کیا۔ انھوں نے اس سے علاوہ ایک اور تفسیر "الدر المنثور" کے نام سے بھی لکھی جو کافی مبسوط ہے۔

اس کے بعد اور بھی بہت سی تفاسیر لکھی گئیں جن کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن ان میں کوئی ایسی نہیں جو پچھلی تفسیروں کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر لکھی گئی ہو اور جن میں روایات سے قطع نظر تحقیق و درایت سے کام لیا گیا ہو۔

۲۹ اپریل سنہ ۶۲ء کی ایک شام دلی میں

بہ یادِ آں کہ تو بودی غزل سرا و نیاز
دلش تپید و گہر ہائے اشک پیہم ریخت

ممتاز مرزا :-

بہت دعوے کیے ہیں آگہی نے
محبت کو نہیں سمجھا کسی نے،
انھیں بھی ہے شکایت زندگی سے
جنھیں سب کچھ دیا ہے زندگی نے،
مہ و انجم کو ضو بخشی ہے ممتاز
ہمارے آنسوؤں کی روشنی نے،

وہ شوخِ گلعذار چلا کس پھبن کے ساتھ
خوشبو صبا اُڑاتی چلی پیرہن کے ساتھ،
مژدہ ہو اے جنوں، کہ بنامِ خدائے گل،
فصلِ بہار آئی ہے دار و رسن کے ساتھ،
لو آج مر کے راہِ وفا سے گزر گئے
ان کی گلی سے جاتے ہیں کس بانکپن کے ساتھ

عشق نے ظلم وہ ڈھایا ہے کہ جی جانے ہے
اس قدر ہم کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
وہ مدارات تو کیا، پرسشِ پنہاں بھی نہیں
ایسا نظروں سے گرایا ہے کہ جی جانے ہے
ہائے اک دوست کی بیگانہ وشی نے ممتاز
تیر وہ دل پہ چلایا ہے کہ جی جانے ہے

اے محوِ انتظار! سحر کی دُعا نہ مانگ
کچھ اور درد مانگ خدا سے دوا نہ مانگ
شاہد ہے میرے جرم کی یہ ساری کائنات
مجھ سے ثبوتِ جرمِ وفا بے وفا نہ مانگ
تیرے شعورِ غم پہ طلب کا ہے انحصار
کیسے بتاؤں، عشق میں کیا مانگ کیا نہ مانگ
ہونا پڑے نہ حشر میں قاتل کو شرمسار
ممتاز جو ہوا سو ہوا خوں بہا نہ مانگ

آخر کسی کو کہہ تو سکیں رفتۂ بہار
پھولوں کی طرح چاک گریباں کوئی تو ہو
برقِ چمن کو ہم سے عداوت نہیں مگر
صحنِ چمن میں سوختہ ساماں کوئی تو ہو
کوئی کلی تو کھل کے ہنسے صحنِ باغ میں
اے دل، حریفِ گردشِ دوراں کوئی تو ہو

حدیثِ شوق کبھی نغمۂ جنوں بن کر
مرے لبوں پہ اگر آ گئی تو کیا ہوگا
یہ چاندنی جو تیری یاد سے عبارت ہے
یہ چاندنی بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
میں دل کو راہِ وفا سے ہٹا تو لوں ممتاز
جبیں نشانِ قدم پا گئی تو کیا ہوگا

دشمنِ ہوش و خرد، دشمنِ جاں، دشمنِ دیں
ایسا دشمن، دلِ بے تاب کہاں سے لاؤں

زندگی جس کے سہارے سے گزاری ہم نے کبھی
جانے کیوں آج اُسی نام پہ رونا آیا
قافلہ ایسا لُٹا دل کی تمناؤں کا
منزلوں تک مجھے ہر گام پہ رونا آیا

وقت

(بنامِ ایشیا)

پروفیسر شور (علیگ)

آسماں میری جبیں، سورج مرے ماتھے کا داغ
ماہِ تاباں میرا دیپک، کہکشاں میرا چراغ

"حال" میرا نقشِ پا، "ماضی"، مرے صحرا کی خاک
"آخرت" میری قبا، "دُنیا" مرے دامن کا چاک

اک نفس میرا "ازل"، اک سانس ہے میرا "ابد"
سرحدِ کونین سے کچھ ماورا ہے میری حد

از سوادِ کفر و دیں تا سجدہ گاہِ جبرئیل
میں نے تابوتِ حوادث میں جڑی ہے اپنی کیل،

آدم و ابلیس دونوں میرے زنداں کے اسیر
میں ہی آدم کی رسوائی، میں یزداں کا ضمیر

آدمی، حیواں، فرشتے، سب مرے بیٹوں کے نام
میری اُمت مومن و زندیق و سلطان و غلام

عارف و اوباش و رند و احمق و عزت مآب
کون سی گردن ہے وہ جس میں نہیں میری طناب

زر پرست و فاقہ مست و سفلہ و اہلِ شرف
سب مرے صیدِ زبوں، سب میرے تیروں کے ہدف

کجکلاہ و دیں پناہ و زاہد و زنار دار
ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے میرے شکار

"ناقد" و "فنکار" ہوں یا بایزید و بولہب،
ناچتے ہیں میرے سازِ مصلحت پر سب کے سب

جہل کے معبود ہوں یا علم کے لات و منات
اہرمن.... یزداں... سبھی چلتے ہیں میرے ساتھ ساتھ

میں کلیسا کی نوا، میں نغمۂ دیر و حرم
میں مسیحا کی شریعت، میں ہوں گوتم کا دھرم

قدسیوں کی بندگی، خلوت نشینوں کا درود
جبہ و دستار کے آنسو، تقدس کا سجود

جامِ کوثر، سایۂ طوبیٰ، دمِ روح الامیں
کون سا نغمہ ہے وہ جو میرے بربط میں نہیں،

رنگ لاکھوں ہیں مرے ہر پیکرِ تصویر کے
رکھ دیا ہے میں نے دل "لوح و قلم" کا چیر کے

میں ہوں رخساروں کا شعلہ، میں بھرے سینوں کی آگ
میں ہوں آدم کی جوانی، میں ہوں حوّا کا سہاگ

عارضوں کی جھرّیاں، ماتھوں کے بل، چہروں کے رنگ
میرے ہاتھوں کی لکیریں، میرے ترکش کے خدنگ

کانپتے ہاتھوں کا رعشہ، قامتِ پیری کا خم
میرے نغموں کا تموج میری لے کا زیر و بم

انتقامِ حسن چہروں سے جہاں لیتا ہوں میں
زخمیوں کے ہاتھ میں آئینے دے دیتا ہوں میں

میں ادب کا محتسب ہوں، میں سیاست کا مدیر
میرے دھاروں پر بہا کرتا ہے آدم کا ضمیر

ہو ضمیروں کی تجارت جب سرِ بازارِ عام
آدمی کیا اپنا یزداں بیچ دیتے ہیں غلام

ظلمتیں بکتی ہیں جب بازار میں سورج کے دام
چھین لیتے ہیں اندھیرے نور سے تابِ کلام

سوئے ساحل جب گمر بڑھتا ہے سیلِ حادثات
نیّت صرصر سے تھرّاتی ہے شمعِ کائنات.

چیرتا ہے جب کسی پربت کا سینہ میرا ہل
زندگی کو آتشیں لاوا پلاتی ہے اجل

خون کا سیلاب ہو یا بارشِ ابرِ کرم
داستاں مقرد رقم ہو کہ تاریخِ عجم

نشترِ یزداں بھی ہوں میں عظمتِ انساں بھی ہوں
فتنۂ تاتار بھی ہوں، نوح کا طوفاں بھی ہوں

بھوک پر میری کمندیں، قہقہوں پر میرا دام
ہڈیاں شاہ و گدا کی پیسنا ہے میرا کام

سیم و زر کے دیوتا ہوں یا تقدس کے امیں
پستے ہیں میرے شکنجے میں خدایانِ زمیں

میں خدائے تیرگی، میں خالقِ ہر آفتاب
میں تلاطم، میں سفینہ، میں سکوں، میں اضطراب

نغمۂ شادی بھی میں ہوں نوحۂ ماتم بھی میں
تیر بھی میں، زخم بھی میں، زخم کا مرہم بھی میں

الجزائر ہو حبش ہو، شام ہو یا خاکِ نیل
ہر سمندر میرا صدقہ، ہر زمیں میری سبیل

میری فطرت ہے تغیر، میری سنت انقلاب
میں ہی دریا، میں ہی طوفاں ہی خود موجِ سراب

چین سے تا حدِ مغرب ہے مرے طوفاں کا جھاگ
ایشیا میرا مقدر حریت میرا سہاگ!!

انٹرویو

(پبلک سروس کمیشن کی ملازمت کیلئے)

(واہی)

"آپ کی تعلیم؟" "بی اے پاس ہوں عالی جناب!"
"کمبی نیشن؟" "ہسٹری، اُردو ادب، علم الحساب!"

"ہسٹری؟ اچھا تو یہ کہئے اشوکا کون تھا؟"
"پاٹلی پُترا کے شاہنشاہ اکبر کا چچا!"

"اور فرمایئے وکٹوریہ کس کا ہے نام؟"
"پالکی گاڑی سواری کے لئے جیسے ٹرام!"

"کون الجبرا کا موجد ہے، بتائیں تو ذرا؟"
"موجد اس کا الجزائر میں کوئی ڈیگال تھا"

"اور اقلیدس اُپچ ہے کس ستم ایجاد کی؟"
"وہ تو اک تخلیقِ بے تمثیل ہے فرہاد کی!"

"اصطلاحِ عام میں کیا چیز ہے جمہوریت؟"
"متصلِ تبت سے اک آزاد چھوٹی سلطنت!"

"یہ تو کہئے چانگ کائی شیک کس کا نام ہے؟"
"فارسی میں حضرتِ سعدی کا عرفِ عام ہے!"

"میرزا غالب کے بارے میں بھی ہیں کچھ جانتے؟"
"کیوں نہیں؟ ہم شاعرِ اعظم ہیں ان کو مانتے!"

ذوق کے شاگرد ہیں ہم عصرِ میر و شاد ہیں
شاہنامے کے مصنف ہیں، جگت اُستاد ہیں!"

"خوب! کوئی شعر ان کا یاد تو ہوگا ضرور؟"
"ایک کیا؟ سنئے پچاسوں شعر پڑھتا ہوں حضور"

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے!"

"شکریہ! حاضر جوابی آپ کی ہے بے نظیر!
آپ آگے چل کے بن سکتے ہیں اک اچھے وزیر!"

(حبیب احمد صدیقی)

صیاد و برق و باد کا شکوا بھی چھوڑ دے
جب آشیاں چھٹا تو یہ رونا بھی چھوڑ دے

ملتی نہیں فراق میں لذّت اگر تجھے
تسکینِ چشم و دل کی تمنّا بھی چھوڑ دے

جب چاہتے ہیں عہدِ وفا کو وہ بھولنا
پھر ملتجی نظر سے تقاضا بھی چھوڑ دے

اک شغل تو ہے وہ گلۂ جور ہی سہی
ایسا کہیں نہ ہو کہ ستانا بھی چھوڑ دے

جب اندمالِ زخمِ کی امید ہی نہیں
بہتر یہی ہے فکرِ مداوا بھی چھوڑ دے

غم سے نجات پانے کی خواہش بجا سہی
کیا ہو جو آدمی غمِ فردا بھی چھوڑ دے

شارق ایم۔ اے)

رہِ مہر و وفا کا ذرّہ ذرّہ جیسے کہتا ہو
نہ جانے کب سے اس منزل میں دیوانے نہیں آئے

رہی محرومیٔ ذوقِ یقیں تک کفر سامانی
پھر اس کے بعد رستے میں صنم خانے نہیں آئے

محبّت کا فسانہ سننے والو، جان لو یہ بھی
کہ ہم سود و زیاں کے راز سمجھانے نہیں آئے

انھیں سے قدر ہے کچھ تیرے میخانے کی اے ساقی
کہ جن کے ہاتھ میں مدت سے پیمانے نہیں آئے

یہ مانا بے حقیقت ہے جہانِ رنگ و بو شارق
مگر ہم بھی فریبِ آرزو کھانے نہیں آئے

رشد صدیقی)

موت ہے بارِ غمِ ہستی سے گھبرانے کا نام
زندگی ہے مسکرا کر، زہر پی جانے کا نام

ہر نئی انگڑائی، ہر زنجیر کی جھنکار پر
گونجتا ہے آج بھی زنداں میں دیوانے کا نام

موسمِ ارماں کہو یا رو کہ فصلِ داغِ دل
کچھ تو رکھو آنسوؤں کے جام چھلکانے کا نام

جب مرتب ہو گی تاریخِ بہارِ زندگی
اس کا عنواں ہو گا ارشدؔ اپنے ویرانے کا نام

ید حرمت الاکرام)

صحرائے آرزو میں کہیں کھو کے رہ نہ جائے
بڑھ کر ذرا پکار لو تم دل کو ایک بار

یہ کائنات دل میں چھپائے ہزار درد
کرتی ہے کب سے ایک مسیحا کا انتظار!

لالہ کے دل کا داغ اُبھرتا چلا گیا
مڑ مڑ کے دیکھتی رہی جاتی ہوئی بہار

مطبوعات موصولہ

اُردو مثنویاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تصنیف ہے اور ایسے موضوع پر جس سے ہر ادیب واقف ہے، لیکن اس کو چھو
کی جرأت کسی نے نہیں کی۔ مثنوی پڑھکر اس سے لطف اُٹھانا تو آسان ہے لیکن اس کی تصنیفی، تاریخ
وادبی حیثیت پر گفتگو کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

یہ دور ادبی تحقیق کا دور ہے، اور اب علم و فضل نام صرف کتابیں پڑھ لینے کا نہیں، بلکہ ہر کتاب کی ہیئت وضعی، اس کے تار
وروایاتی پس منظر اور اس کی تصحیف و تصحیح سے تعلق رکھتا ہے، جس کے لئے مرتب کو خدا جانے کن کن لائبریریوں کی خاک چھاننا پڑتی
اور کتنی موشگافیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کی یہ کتاب بھی اسی عرق پیشانی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں اُردو کی صرف ان مثنویوں کا ذکر کیا گ
ہے جو ہندوستانی قصوں یا لوک کہانیوں سے تعلق رکھتی ہیں، پہلا باب پورانک قصوں سے متعلق ہے جس میں مثنویات نل دمن
وساوتری کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں لوک کہانیوں کی مثنویوں سے بحث کی گئی ہے، مثلاً طوطی نامہ، منوہر و مدھومالتی، سندر
سنگھاسن بتیسی وغیرہ، تیسرے باب میں نیم تاریخی قصے لئے گئے ہیں، جیسے ہیر و رانجھا، سسی پنوں، پدماوت وغیرہ۔ چوتھے باب میں
ایرانی قصوں کا ذکر ہے جیسے مثنوی پھول بن، سحر البیان اور گل بکاؤلی۔ اس کے بعد ضمیمہ میں متعدد مثنویوں پر گفتگو کی گئی ہے اور اس
یہ کتاب تقریباً ایک سو اُردو مثنویوں کی تصحیف و تاریخ ہے۔ مثنوی اُردو کی بڑی قدیم صنف سخن ہے اور بیانیہ شاعری ہونے کی حیث
سے بڑا اہم درجہ رکھتی ہے۔ لیکن بہت سی مثنویاں ایسی ہیں جن کا ہمیں علم بھی نہیں اور اب ڈاکٹر نارنگ کی اس کتاب سے ہمیں
وجود کا علم حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے اس موضوع پر جتنا مواد فراہم کیا ہے وہ بڑی محنت، کاوش اور وقت چاہتا تھا اور اسی کے ساتھ خا
سلیقہ بھی۔ سو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر نارنگ کی اس کتاب میں یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں اور ممکن نہیں
کوئی شخص اس موضوع پر کچھ لکھے اور ڈاکٹر نارنگ کی اس کوشش سے فایدہ اُٹھانے پر مجبور نہ ہو۔

اس کتاب کو مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی نے بڑے حسن اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے اور چھ روپیہ میں اسی پتہ سے مل سکتی

پرچم ضیا جناب برہم ناتھ دت کی تالیف ہے جس میں انھوں نے تمام مشہور مذاہب و مسالک کی اخلاقی تعلیم کو پیش کر
بتایا ہے کہ اصل چیز مذہب انسانیت ہے اور تفریق کفر و امتیاز بالکل لایعنی سی بات ہے۔

موصوف نے سب سے پہلے ویدوں کے اقتباسات اور اکابر ہندو دھرم کے اقوال پیش کئے ہیں اسکے بعد پارسی مذہب
اخلاقی تعلیم کو لیا ہے اور پھر بودھ، کنفوشس، سوامی مہابیر (بانی جین مذہب) کی تعلیمات سے بحث کرنے کے بعد، یہو
عیسوی، اسلام اور سکھ مت کے اصول اخلاق کو پیش کیا ہے۔

موصوف کے ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی کا اختلاف دراصل اصول مذہب سے کوئی تعلق نہیں
بلکہ اس کا حقیقی سبب محض ان مذاہب کی غلط تعبیر و تفسیر ہے۔ اس میں شک نہیں اس قسم کی کتابوں کی ہمیشہ ضرورت

ر موجودہ زمانہ میں جبکہ مادہ پرستی نے سرے سے مذہب ہی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو دُنیا
معلمین اخلاق کے اقوال و ارشادات کو سامنے لائے اور موجودہ دورِ اضطراب میں سکونِ دل کا سامان مہیا کرے۔

فاضل مولف نے اس کتاب کی ترتیب و تشکیل کے لئے کتنا مطالعہ کیا ہوگا اور جس خلوص نیت کے ساتھ اس کو پیش کیا گیا
اس کا صحیح اندازہ کتاب کے دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

مختلف مذاہب کے جواہر ریزوں کو یکجا کرنا آسان کام نہ تھا اور اس کو وہی جوہری کر سکتا تھا جو خود بھی پرکھ رکھتا ہو
اس سے قبل اسی قسم کی ایک کتاب (ڈال ڈال پات پات) پر جو فاضل مولف کے اخلاقی خطوط کا مجموعہ ہے حکومت پنجاب
رف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام مل چکا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ مولف کی یہ دوسری کوشش بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی
ئے گی۔ یہ کتاب ۱۲؍ میں مولف سے کرشن مارکٹ امرت سر کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

علۂ نوا جناب تلوک چند محروم کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں تین دور قایم کرکے ہر ہر دور کی غزلیں علحدہ شایع کی
گئی ہیں۔ پہلا دور سنہ ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۳۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور سنہ ۳۲ء سے سنہ ۴۷ء تک
لیکن ان تینوں ادوار کی غزلوں میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

جناب محروم نظم گو شاعر ہیں اور اتنے جید و پر گو کہ ان کی نظموں کے متعدد مجموعے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں اسلئے
تاً ان کی غزلوں میں بھی رنگ غالب وہی ہونا چاہئے جو نظموں میں پایا جاتا ہے، یعنی وہی سادگی بیان و زبان، وہی خلوص
بات و تاثرات ـــ اس میں شک نہیں کہ غزلیں کلاسکل انداز کی ہیں، لیکن دور از کار اور مبہم تعلیمات سے پاک ہیں۔
ب محروم کی نیک نفسی و پاکیزگی احساس ان کی غزلوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے، اور اس لحاظ سے کہ ان میں صحیح درس زندگی بھی
یا ہے، وہ بہترین نظم کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔ قیمت ۸؍۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر دہلی۔

اہر پارے مجموعہ ہے جناب چودھری برہم ناتھ دت کے ان اقتباسات کا جو انھوں نے دوران مطالعہ میں قلمبند کئے
تھے۔ ان شذرات کے علاوہ جو خود ان کے زائیدۂ فکر ہیں، باقی تمام اقتباسات انگریزی سے کئے گئے ہیں۔ یہ
جواہر پارے اس اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں یا دنیائے محبت و خلوص کے ان مظاہر سے جنھیں انسان محسوس تو کرتا ہے،
ظاہر نہیں کر سکتا۔

اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف کا دائرۂ مطالعہ کتنا وسیع ہے اور ان کا ذوق انتخاب کتنا بلند۔
قیمت ۶؍۔ ملنے کا پتہ:۔ مصنف، کرشن مارکٹ امرت سر۔

ی مجموعۂ کلام ہے جناب وشوا ناتھ درد کا جسے اٹل پبلیکیشنز نئی دہلی نے شایع کیا ہے اور بڑے حسن و اہتمام کے ساتھ۔
اس مجموعہ کی سب سے پہلی خصوصیت جو مجھے پسند آئی یہ ہے کہ اس میں کسی ادیب یا نقاد کا مقدمہ شامل نہیں ہے۔
ری خصوصیت اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ ابتدا میں انھوں نے خود اپنی شاعری کے محرکات اور اس کی تاریخ کا مفصل
دیا ہے جس میں انھوں نے پوری صفائی سے کام لیا ہے اور خواہ مخواہ عجز و انکسار کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ یہ بات بڑی خود اعتمادی کی
اور جب تک یہ خصوصیت کسی شاعر میں پیدا نہ ہو اسے اپنا کلام شایع نہ کرنا چاہئے۔

اس مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، لیکن ان کے درمیان بہ لحاظ جذبات و تکنیک کوئی خط فاصل نہیں کھینچ سکتے۔
لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب درد دراصل ایک غزل گو شاعر ہیں اور تغزل ہی کے رکھ رکھاؤ پر ان کے فن کا انحصار ہے۔
درد کی شاعری ایک مخصوص پیرایۂ احساس کی شاعری ہے جو نہ غم جاناں ہے نہ غم دوراں لیکن ان دونوں کا "احساس تماشہ"
ہے جو خود شاعر کے تجربات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا انداز بیان موثر تو نہیں ہے لیکن رو کش حقیقت یقیناً ہے اور اس لئے

درد کو ہم ہر حیثیت سے حقیقت نگار شاعر کہہ سکتے ہیں۔

ان کے بعض اشعار جو مجھے اور انھیں دونوں کو پسند ہیں یہ ہیں :-

یارانِ بے وفا مجھے اتنا بتا گئے
جسمیں وفا کا رنگ نہ ہو وہ دوستی نہیں

ان کا دامن چھونے والے
اپنا ہاتھ بھی دیکھا ہوتا

ذرا اے گردشِ ایام رک جا
کہ تیرے ساتھ ہم بھی آرہے ہیں

ترے خیال سے قایم ہے زندگی کا جمال
یہ اور بات ہے اب تجھ سے دوستی نہ رہی

آپ کچھ سوچ کر ہنسے ہوں گے
ہم تو بے وجہ مسکرائے ہیں

سوزِ دروں

جناب سلیمان آصف بنارسی کے قطعات و منظومات اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جسے انجمن تعمیر ادب بنارس نے شایع کیا ہے اور عہ میں مل سکتا ہے۔

آصف نوجوان شاعر ہیں اور اسی زمانہ سے ان کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے، جب غزل گوئی کا رواج ملک میں کم ہو چلا تھا اور نظم نگاری کی طرف عام توجہ ہو چلی تھی۔ اس لئے جناب آصف نے بھی اسی رجحان سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی اور ان کی غزلوں میں بھی نظم کا رنگ چھا گیا۔

ان کی نظمیں اکثر مسایل حاضرہ سے متعلق ہیں اور کافی جوش و ولولہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔

حرفِ خاموش

مجموعہ ہے جناب حمید ناگپوری کی غزلوں، نظموں اور رباعیات وغیرہ کا، جسے "اپنا کتاب گھر" کامٹی نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ان کی شاعری کے متعلق بعض مقتدر نقادوں اور ادیبوں کی رائے بھی شامل ہے اور ان سب نے ان کے کلام کو سراہا ہے۔ جناب حمید کہنہ مشق شاعر ہیں اور اگر صرف وسط ہند کو سامنے رکھا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سرزمین کے سرخیل شعرا ہیں۔ وہ ایک غزلسرا شاعر ہیں اور تغزل کی تمام معیاری خصوصیات جو زبان و بیان اور جذبات و تاثرات سے وابستہ ہیں، ان کے یہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ فنی حیثیت سے بھی وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں اور استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

قیمت تین روپیہ ہے۔

چشمِ نگراں

مجموعہ ہے جناب حامد عزیز مدنی کی نظموں کا۔ ابتدا میں "آزادی کا افق" کے عنوان سے ان کا ایک بسیط مقدمہ نظر آتا ہے، جس میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے اس بدلتی ہوئی ذہنیت کا جایزہ لیا ہے جس نے پچھلی صدی میں ہمارے ادب و ذوقِ ادب کو متاثر کیا۔ میری رائے میں ان کا یہ مقدمہ بہترین انشائیہ ہے، اور اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔

جناب مدنی کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہے جو کلاسکل پابندیوں کے زیادہ قایل نہیں، تاہم انھوں نے وزن عروضی سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے اور ردیف و قوافی کی پابندی کا بھی بعض نظموں میں خیال رکھا ہے۔

یہ نظمیں اپنے انداز بیان کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں اور جذبات و خیالات کے اعتبار سے نتیجۂ فکر عمیق۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمانہ حال کے شعراء میں جناب مدنی ایک گرانقدر شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کی ترقیاں بھی ان کے حال ہی میں شامل ہو گئی ہیں۔

قیمت ہے، ملنے کا پتہ :- بیان پبلی کیشن۔ کوئنز روڈ۔ وکٹوریہ روڈ۔ کراچی۔